www.urducouncil.nic.in
قیمت: ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

دسمبر 2023

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 12 دسمبر 2023

مدیر اعلیٰ : پروفیسر دھننجے سنگھ

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم بحکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)

اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ		
مشعل	مدیر	4
شخصیت		
ایامِ غدر کی ایک شاعرہ: نواب اختر محل اختر	عذرا انجم	5
نکہت سخن		
شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں		
سرلا دیوی اور افسانہ 'نیا جنم'	رضیہ پروین	10
منفرد خاکہ نگار: شوکت تھانوی	گلفشاں انجم	12
مہاراشٹر میں اردو ناول کی صورت حال	ڈاکٹر حبیب النساء بیگم	15
نگار عظیم کے افسانوں میں حقیقت نگاری: مجموعہ 'عکس' کی روشنی میں	عارف این	20
مسائل نسواں کی ترجمان: اعجاز شاہین	ڈاکٹر عزیز احمد خان	23
شاذ تمکنت: شخصیت اور فن	صبیحہ شمیم	27
قرۃ العین حیدر اور انیتا دیسائی کے ناولوں میں تفاوت و مماثلت	محمد یونس انصاری	30
ہندوستان کی روشن خیال خواتین	حدیثہ افضل	36
ذکیہ مشہدی بحیثیت افسانہ نگار	محمد عمر	39
عقیلہ کی افسانوی کائنات "بکھرے رنگ" کے آئینے میں	جاسی اختر	43
مصنوعی ذہانت کے منفی اثرات	مائشہ	46
حسن سخن		
ڈاکٹر سمیہ ساجد، ڈاکٹر نورینہ پروین، صدف جمال		48
افسانہ		
ادیب	فرخندہ ضمیر	50
کہاں ہو تم	فرحہ جبین	53
اردو ہے میرا موبائل	محمودہ قریشی	55
صحت		
بنور لبنیہ (مہاسے)	ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی	59
قارئین کے خطوط		
مراسلہ		62

مشعل

ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں خواتین کے رول سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم یافتہ خواتین معاشرے میں ترقی کا باعث بنتی ہیں۔

خواتین تعلیم، صحت، کھیل، سماجی فلاح و بہبود اور دیگر شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی قابلیت کا لوہا منوا رہی ہیں۔ مشرقی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے آج خواتین ہر شعبے میں اپنی قابلیت کے ذریعے اپنی شناخت متعین کر رہی ہیں۔ پراعتماد خواتین ملک وقوم کے لیے ایک بہترین اثاثہ ہیں۔

آج کی تعلیم یافتہ خواتین انتظامیہ، ملٹری، عدلیہ، درس وتدریس وغیرہ بے شمار اور بہت مشکل شعبوں میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ اصلاح معاشرہ کے عمل میں خواتین کا کردار مردوں کے مقابلے بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ عورت نسل نو کی پرورش کرتی ہے۔ اپنے نظریات، طرز فکر اور اپنی شخصی خوبیوں کو وہ معاشرے کو منتقل کرتی ہے۔ آج ہم معاشرے میں اخلاقی گراوٹ دیکھتے ہیں اس کی اہم وجہ تعلیمی بیداری کی کمی ہے۔ اگر مائیں تعلیم یافتہ ہوں گی تو وہ بچوں کی پرورش پرداخت بہتر طریقے سے کر سکتی ہیں۔

ملک کی قیادت میں خواتین کا اہم کردار رہا ہے۔ خواتین کی ترقی میں حائل رکاوٹوں اور تقاضوں کا مقابلہ تمام شعبہ جات خصوصاً سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، ریاضی اور دیگر غیر روایتی کورسز میں خواتین کی شمولیت کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ سماجی بیداری میں بھی ان کا اہم رول ہے۔ عورتوں نے سماج میں بیداری کے لیے بہت سی مہم بھی چلائی ہے۔ انھوں نے ملک کی ترقی میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔ خواتین نے تمام چیلنجز کا مقابلہ پختہ عزم اور بہادری کے ساتھ کیا ہے۔ ہندوستان میں خواتین کو اگر بااختیار بنایا جائے تو خواتین ہندوستان میں نئی نئی تبدیلیاں لاسکتی ہیں اور ملک وقوم کی خدمت اور بہتر طریقے سے انجام دے سکتی ہیں۔ حکومت بھی اس کے تئیں سنجیدہ ہے اور خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہے۔ بہت سی اسکیمیں حکومت نے خواتین کے لیے مختص کی ہیں۔ حکومت اس جانب سنجیدگی سے سوچتی ہے اور چاہتی ہے کہ ملک کی خواتین مثبت سوچ کے ساتھ آگے بڑھیں اور اس سمت میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکیں تا کہ ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل ہو سکے اور ایک بہتر معاشرہ وجود میں آسکے۔

آپ کا

پروفیسر دھننجے سنگھ

ایامِ غدر کی شاعرہ
نوابِ اختر محل اختر

عذرا انجم

1857 کی جنگِ آزادی اور انگریزوں کے مظالم نے ہم سے کیا کچھ نہیں چھینا۔ کتنے کتب خانے، کتنے تعلیمی ادارے، کتنے رسائل و جرائد جلا کر خاک کر دئے گئے۔ جان داروں کو جان دار نہیں سمجھا گیا۔ انسانیت کو بار بار خاک میں ملایا گیا۔ انسانی رشتوں کو پامال کیا گیا۔ میر، درد، غالب، مومن سب نے اپنے کلام میں اپنا اپنا درد بیان کیا ہے۔ اردو شعرا کے ذخیرے کے علاوہ بہت سی شاعرات بھی اردو ادب کی تاریخ کا حصہ رہی ہیں لیکن افسوس کہ آج اردو دانوں کا بڑا حصہ ان سے ناواقف ہے۔ وہ شاعرات جن کے اندر اردو شعر و ادب کا ذوق و شوق، جوش و جذبہ موجود تھا انہوں نے بھی دل جلا دینے والی شاعری کی ہے لیکن ان کا سب کلام تو نذرِ آتش ہو گیا۔ باقی ہے تو بس بیاضوں میں ان کا ذکر۔ کلام فنا ہو گیا، شاعرات دیارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ نظر آیا تو بس ہزار جگہ نظر دوڑانے کے بعد کسی ایک کم یاب تذکرے میں ان کا مختصر سا ذکر اور چند اشعار۔

جس طرح بیگم عالیہ، بادشاہ بیگم، طقلانی بیگم، بختاوری، پھول بہار بی بی، جمیلہ اور حبیبہ جیسی خواتین کے بارے میں لوگ یہ نہیں جانتے کہ یہ اور اِن جیسی دیگر خواتین نے جنگِ آزادیٔ ہند میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے بلکہ شہید بھی ہوئی ہیں اسی طرح بہت سے لوگ ہماری بھولی بسری شاعرات سے واقف نہیں۔ اردو کے مشہور و معروف تذکروں میں بھی شاعرات کو نظر انداز کیا گیا ہے لیکن کچھ تذکرے اردو میں ایسے بھی موجود ہیں جو صرف شاعرات پر لکھے گئے ہیں اور اُن تذکروں میں شعرا حضرات کا ذکر موجود نہیں صرف شاعرات کی ہی بات کی گئی ہے۔ مثلاً تذکرہ "شمیمِ سخن'' (1891) از مولوی عبدالحئی، تذکرہ "شاعراتِ اردو" (1944) از محمد جمیل احمد، "تذکرۃ الخواتین" (1893) از عبدالباری آسی اور اسی طرح کے دیگر تذکرے بھی ہیں جن میں صرف شاعرات کا ذکر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ امراؤ دہلوی، امراؤ لکھنوی، جینا بیگم، حیدری بیگم، جعفری کاملہ بیگم اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ انہیں شاعرات میں ایک اہم نام اختر دہلوی کا ہے۔ اختر دہلوی قلعۂ معلیٰ کی بیگمات میں سے تھیں۔ انھوں نے 1857 کی جور و ظلم کی بجلیاں محسوس کی تھیں۔ جب انگریزوں نے اس پردہ نشیں خاتون کو وثیقے کے لیے مقابل آنے کی شرط رکھی تو یہ شعر جواب میں لکھ کر دیا :

آستاں پر تیرے پیشانی کو گھستے گھستے
سر ہی غائب ہوا جس میں تیرا سودا تھا

اختر دہلوی نے انگریزوں کے سامنے جانا پسند نہیں کیا اور تاعمر دُکھ اور تکلیف میں بسر کرتی رہیں۔

اختر دہلوی کا کوئی باضابطہ دیوان یا شعری مجموعہ اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن کافی ورق گردانی کرنے پر چند غزلیں اور قطعات جو دورانِ غدر ضائع ہونے سے بچالیے گئے تھے، اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایک غزل جس کی ردیف ''ا'' اور قافیہ ''مٹا''، ''جلا''، ''اڑا''، ''اڑا''' ''پڑھا'' وغیرہ ہے۔ اس غزل کا مطلع سوزِ دروں کی جس تپش کا پتہ دے رہا ہے وہ ملاحظہ کیجیے :

ایک آہِ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

''ایک آہِ شعلہ بار......'' اور '' آستاں پر تیرے......''

دونوں اشعار براہِ راست دل پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ بندش کی چستی اور زبان کی صفائی کے ساتھ محاورے کا دلکش استعمال کیا گیا ہے۔ آج جب زمانہ بدل چکا ہے۔ بدلتے وقت نے خواتین کو بھی بہت سی سہولیات عطا کر دی ہیں۔ پہلے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ یعنی لکھنا اور پھر اس کو شائع کرا لینے کا رواج عام نہیں تھا۔ اُس زمانے میں شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ مشاعرے کا یہ رواج تھا کہ شعرا باری باری اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ حالانکہ یقین کرنا مشکل ہے کہ جس شاعرہ نے انگریزوں کے مدمقابل جانا پسند نہیں کیا اور وثیقے سے زیادہ ضروری ان کا پردہ تھا وہ کس طرح مشاعروں میں شریک ہوتی ہوں گی خیر وہ ان کا مسئلہ ہے۔ آپ موصوفہ کی اسی غزل کا حسنِ مطلع ملاحظہ فرمائیں :

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

اس شعر کو اپنی کتاب '' شاعرات کا تذکرہ'' میں لکھتے ہوئے نسیمہ دہلوی لکھتی ہیں کہ :

''جس مشاعرے میں یہ غزل پڑھی گئی اس میں بہت سے اساتذہ موجود تھے۔ سب نے ہاتھ سے غزلیں رکھ دیں اور تحسین مرحبا کا ایک شور برپا ہوگیا۔''

(''شاعرات کا تذکرہ''، از نسیمہ دہلوی، ص۔6، اشاعت: صفحہ غائب۔)

درج بالا شعر امیجری، کیفیات اور محسوسات سے بھر پور ہے۔ پہلے مصرعے میں زمیں پر نام لکھنا اپنے آپ میں ایک پرمسرت بات تھی۔ لکھ کر مٹا دینا مقابل شخص کی دل جوئی اور اس کی اپنی طبیعت کی خوشنودی کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں وہ شخص جس کا نام لکھ کر مٹا دیا گیا وہ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا اظہار بس ایک گہرے جملے سے کرتا ہے کہ'' تمھارے لیے تو بس یہ کھیل تھا لیکن ہم تو تمھاری دل جوئی کے سبب خاک میں مل گئے۔'' یہاں شاعرہ کے لب و لہجے میں شکایت بھی ہے اور ملال کی کیفیت بھی۔ جس کی شکایت کی جارہی ہے وہ کوئی اور ہے اور جس سے شکایت کی جارہی ہے وہ کوئی اور۔ محاورہ ''خاک میں ملانا'' کے موزوں استعمال سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوگیا ہے۔ درج بالا شعر ''لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا: اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا'' کے بارے میں محمد جمیل احمد اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں کہ:

''حیاتِ انیس میں یہ شعر میر انیس کے نام سے درج ہے''

(''شاعراتِ اردو''، از محمد جمیل احمد ، اشاعت۔ 1944)

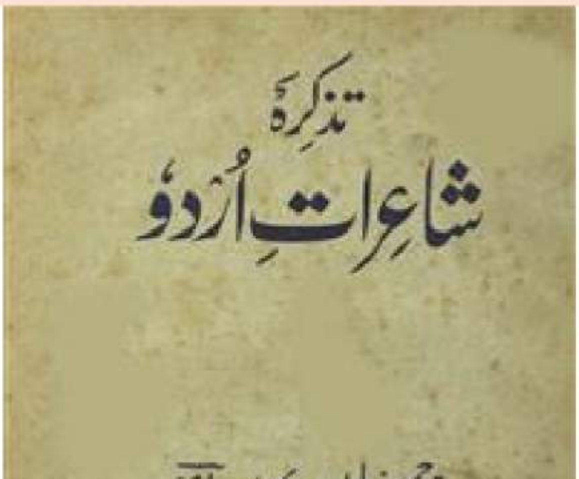

غالبًا درج بالا مختصر بیان میں سید امجد علی اشہری کی کتاب ''حیاتِ انیس'' کا ذکر کیا جارہا ہے جو سن 1907 میں آگرہ اخبار پریس سے شائع ہوئی۔ لیکن بڑی ورق گردانی کے باوجود یہ شعر اُس کتاب میں نظر نہیں آیا اور نہ ہی کسی دوسرے تذکرہ نگار اور تنقید نگار نے اس بات کی تصدیق کی ہے بلکہ نسیمہ دہلوی نے اپنی کتاب ''شاعرات کا تذکرہ''
عبدالباری آسی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الخواتین''، مولوی عبدالحئی

نے ''تذکرۂ شمیمِ سخن''، اور دیگر مصنفین نے بھی درجِ بالا شعر کو اختر دہلوی سے ہی منسوب کیا ہے۔

نواب اختر محل اختر دہلوی کے بارے میں عبدالباری آسی لکھتے ہیں:

''لفظ لفظ سے مشقِ کلام کا پتہ چلتا ہے۔''

(''تذکرۃ الخواتین'' از عبدالباری آسی، اشاعت 1893، ص:15۔)

کسی استاد کے کلام میں ایک بھی حسنِ مطلع ہو تو وہ کافی ہوتا ہے لیکن اختر کے یہاں حسنِ مطلع اور جانِ مطلع دونوں موجود ہیں۔ اسی غزل کے مقطع میں شاعرہ نے ایک نئے انداز سے دل کا شکوہ اور یار کی پاک دامنی ظاہر کی ہے:

تقصیر یار کی نہ قصورِ عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل نے ہی ہم کو جلا دیا

یہاں شاعرہ غالبًا یہ کہنا چاہتی ہے کہ ہمارا ہی دل رنج و غم اور درد و کرب کی ایک بھٹی تھا جس کی آگ میں ہم جلتے رہے۔ ہمیں جلانے میں نہ ہمارے معشوق کا قصور تھا نہ ہی دشمن کا کوئی ہاتھ۔ آج کل جدید علوم کی تحصیل کا دور ہے اور علمِ نفسیات کے مطابق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ جب ہمیں تکلیف ہوتی ہے اور اُس کا الزام ہم دوسروں پر لگاتے ہیں تو یہ ہماری اپنی کجی کے سبب ہوتا ہے کیونکہ ہمارے جذبات و احساسات پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔

شاعرہ کا کمال یہ ہے کہ جس سوزشِ پنہاں کی آواز اس نے مطلع میں بلند کی تھی وہی مقطع میں آ کر ختم ہوئی۔ حسنِ مطلع کے بعد اب جانِ مطلع ملاحظہ فرمائیں:

خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دیا
غیروں نے آج ان کے تئیں کچھ پڑھا دیا

" ٹکڑے اڑا دیا" یعنی پرزے پرزے کر دیا۔ یہ لب و لہجہ، سادگی اور درد میر کا سا لگتا ہے۔ دونوں کا زمانہ ایک ہے۔ زبان ایک سی ہے۔ جذبات ایک سے ہیں۔ دل و جگر کو خون کرنے کا منظر یوں تو بہت سے شعراء نے پیش کیا ہے لیکن نواب اختر محل نے اس مضمون کی زمین کو آسمان بنا دیا ہے۔ لکھتی ہیں:

تیغِ نگاہِ یار کا دونوں پہ وار ہے
ٹکڑے ادھر جگر ہے، ادھر دل فگار ہے

مصرعوں کی چستی، الفاظ کی در و بست، زبان پر اختر دہلوی کی چابک دستی اور خیال کی پیش کش سبھی کچھ قابلِ ذکر ہے۔ مصنفِ ''تذکرہ شاعراتِ اردو'' میں لکھتے ہیں:

'' اختر دہلوی نہایت ذہین، طبّاع اور نیک مزاج تھیں۔ اُن کے کلام سے پختگی اور کہنہ مشقی ظاہر ہوتی ہے۔ نعت و منقبت سے زیادہ شغف تھا لیکن کبھی کبھی غزل بھی کہتی تھیں۔''

(تذکرہ ''شاعراتِ اردو'' از محمد جمیل احمد، اشاعت 1944ء، ص۔ 159,160)

اختر دہلوی نے شاعری کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ قدیم تذکروں میں ان کی دو ایک تضمین دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ فارسی منقبت کے مشہور شاعر قدسی جن کے کلام کو جلدی کوئی سمجھ بھی نہیں پاتا اُس کی غزل پر اختر دہلوی نے جو مصرعے لگائے ہیں وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا قدسی نے یہ شعر ان ہی مصرعوں کے لیے لکھے تھے۔ ''تذکرۂ مرأتِ خیال'' میں اختر دہلوی کی یہ نعت درج ہے جو فارسی کی ایک مشہور غزل پر تضمین ہے۔

تجھ پہ قربان ہوں اے ہاشمی و مطلبیؑ
کہ ہے مشہورِ دو عالم تیری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو تیرے شوکتِ افلاک دبی
مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی
دل و جاں بادفدایت چہ عجب خوش لقبی

وہ تیر ا نور ہے ماہِ فلک و مہرِ کرم
تیرے جلوے سے منوّر ہوئے دونوں عالم
تاب یوسفؑ کو کہاں ہے کہ تیرے دیکھے قدم
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ جمال است بدیں بوالعجبی

واہ کیا درجہ ہے کیا شان ہے اور کیا رتبہ
خالقِ ارض و سما خود ہے ترا مدح سرا
انبیا کہتے ہیں سب صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ
نسبتِ نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

تو ہے نیسانِ کرم اور سحابِ اکرا م
بھر دیا موتیوں سے دامنِ اُمّید انام
بارآور تیرے باعث سے ہے نخلِ اسلام
نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبزِ مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

سب سے پہلے کیا پیدا ترا اللہ نے نور
پردۂ ذات میں اُس نور کو رکھا مستور
اور اُس نور کا اظہار ہوا جب منظور
ذات پاکِ نو دریں ملک عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

اختر دہلوی اس تضمین کا اختتام کچھ اس طرح سے کرتی ہیں:

دردھیاں کے سبب سے ہے میری جان چلی
اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرض اختر کی بھی قدسی کی طرح سے ہے یہی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

قدسی کی اسی غزل کا ایک نہایت بلند شعر ہے جو سہل ممتنع کے زمرے میں آتا ہے۔ اس پر جو مصرعے اختر دہلوی نے لگائے ہیں اس میں گہرائی اور گیرائی دونوں موجود ہیں۔ یعنی ایک طرف شاعرہ نے بحرِ معصیت کی گہرائی کو برتا ہے دوسری طرف بارگاہِ نبوی کی رفعت بھی پیشِ نظر ہے۔ اور پھر دو متضاد نسبتوں میں جو باہمی نسبت ہے اس کا بھی لحاظ ہے۔

قدسی نے رسولِ اکرم ﷺ کو اپنے ایک شعر میں ''آبِ حیات'' قرار دے کر تشنہ لبی کو فرد کرنے کی استدراع پیش کی تھی۔ اختر دہلوی نے اس میں ایک اور اضافہ کیا۔ حسبِ ذیل تضمین پیش ہے:

سختئ حشر سے گھبرائے گی جب مخلوقات
اور نہ بن آئے گی ائے ابرِ کرم کوئی بھی بات
انبیاء جب بھی کہویں گے کہ ائے ابرِ نجات
باہمہ تشنہ لبی نیم نوئی آبِ حیات
لطف فرما کہ زحدمی گذرد تشنہ لبی

دنیا کے لہو ولعب میں گرفتار ہو کر ہر شخص اپنے اصل مقصد کو بھول جاتا ہے۔ اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد انسان کے پاس ہاتھ ملنے کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتا اور وہ بارگاہِ شفاعت کی طرف رجوع کرتا ہے۔
اس مضمون کو اختر دہلوی کچھ اس انداز میں باندھتی ہیں :

ہوٗ گئی لہو و لعب میں ہی میری عمر بسر
یادِ خالق میں نہ مصروف ہوئی میں دم بھر
گھستی ہوں ناصیہ عجز کو تیرے در پر
چشم رحمت بکشا سوئے من اندازِ نظر
ائے قریشی، لقمی، ہاشمی و مطلبی

قدسی کی اس غزل کا مقطع مشہور ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس مقطع کا لطف کچھ اربابِ ذوق کو ہی آسکتا ہے۔ اختر دہلوی نے ''عرض اختر کی بھی قدسی کی طرح ہی ہے یہی : سیّدی انت حبیبی وطبیبِ قلبی'' کہہ کر اختتامیہ کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ اختر دہلوی ایامِ غدر کی ایک ایسی اردو شاعرہ ہیں جنھیں اُن کے نمایاں لب و لہجے، منفرد آواز اور زورِ کلام کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

□□□

Azra Anjum
Research Scholar
Begum Hazrat Mahal Girls Hostel
Jamia Millia Islamia
New Delhi-10025
zehraazraapex@gmail.com
Mob: 9169473570

شاعرات کے منتخب اشعار

وہ تیرا نور ہے ماہ فلک و مہر کرم
تیرے جلوے سے منور ہوئے دونوں عالم

ہو گئی لہو لعب ہی میں مری عمر بسر
یاد خالق میں نہ مصروف ہوئی میں دم بھر

اختر نواب اختر

عشق دار و مدار ہے اپنا
بے قراری قرار ہے اپنا

خاک میں مل گئی ہوں جس پہ اسیر
اسی دل میں غبار ہے اپنا

آرائش

نہ بوسا دینا آتا ہے نہ دل بہلانا آتا ہے
تجھے تو او بت کافر فقط ترسانا آتا ہے

کسی عاشق کا بے شک استخواں ہے میں نہ مانوں گا
کہ شانہ تیرے رخ تک اتنا بے باکانہ آتا ہے

اشک

باغ عالم میں چھڑانا تھا اگر اپنوں سے
پہلے ہی سبزۂ بے گانہ بنایا ہوتا

گرچہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری
تو مجھے ساکن ویرانہ بنایا ہوتا

امراؤ

جدھر کے دیکھنے سے جان زار جاتی ہے
اسی طرف کو نظر بار بار جاتی ہے

یہ بغض تھا کہ نہ چھوڑا تمھارے کوچہ میں
صبا لیے مرا مشت غبار جاتی ہے

امیر

اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا
ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

جو کچھ کہیں ہیں تجھ کو یقیں ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

بسم اللہ

چھوڑ کر مجھ کو کہاں او بت گمراہ چلا
تو چلا کیا کہ یہ دل بھی ترے ہمراہ چلا

چھٹ گیا غم سے مرا کشتۂ ابر و مرکز
اک چھری میرے گلے پر بھی مری آہ چلا

بنو

برسوں خم گیسوں میں گرفتار تو دکھا
اب کہتے ہو کیا غم نے مجھے مار تو رکھا

اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے عالم
کھڑکی نہ رکھی روزن دیوار تو رکھا

بیگم

(ماخذ: مولانا عبد الباری آسی، تذکرۃ الخواتین' مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، جنوری 1927)

رضیہ پروین

سرلا دیوی اور افسانہ 'نیا جنم'

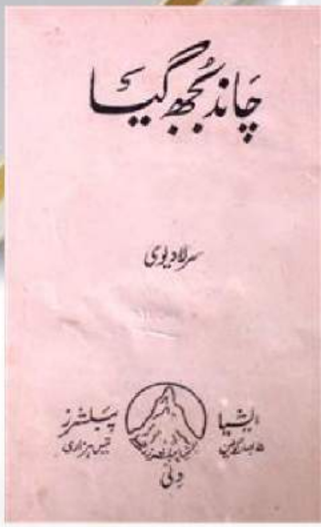

افسانہ نگار کی حیثیت سے سرلا دیوی ایک منفرد ادبی حیثیت رکھتی ہیں لیکن جو شہرت کرشن چندر کو حاصل ہوئی البتہ وہ سرلا دیوی دیوی کو حاصل نہ ہو سکی مگر یہ بھی سچائی ہے کہ کسی خاندان میں اور خاص طور پر ایک ہی نسل میں دو یا تین ادیب کم ہی پیدا ہوئے۔ سرلا دیوی کا اپنا ایک اسٹائل ہے الگ اسلوب ہے ایک انوکھا انداز ہے۔ انھیں انسانی نفسیات کا گہرا تجربہ ہے۔ عورت افسانوی ادب کا ایک خاص موضوع رہی ہے، ہمارے ادیبوں قلم کاروں نے ہمیشہ سے ہی خواتین کرداروں اور ان کے مسائل کو نہایت دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے ان کی زندگی ان کی نفسیاتی جذباتی امور کی بے جھجک عکاسی کی گئی ہے۔ ادب لطیف کے افسانہ نمبر میں ایک جگہ احمد ندیم قاسمی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ: ''کہانی سنانے کے لیے عورت مرد سے زیادہ موزوں ہے، بشرطیکہ کہانی کو صحیح معنوں میں کہانی سمجھا جائے۔'' غرض کی اردو افسانے کی ترویج وترقی میں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے آج افسانوں میں جو لطافت اور توازن قائم ہے اس کا بنیادی پہلو عورت کی ہی دین ہے۔ دیکھا جائے تو سرلا دیوی نے جس طرح اپنے افسانوں کے ذریعے نسوانی جدوجہد کے مختلف پہلو، شخصیت کے اہم خدوخال اس کی نفسیاتی کیفیتوں کو جس سچائی اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنی تحریروں میں ڈھالا ہے وہ آج بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے ان کی بیشتر کہانیاں جس میں پہلی گلابی کرن، چاند بجھ گیا، شاردا، نیا جنم، جہاں ماں باپ بننا عذاب ہے، بھنور، سہارا، شاہراہ، عزت، کلنک وغیرہ کہانیوں میں عورت کی زندگی کا ایک ایسا المیہ پیش کیا ہے جس کو انسانی زندگی کی مشکلات نے تھکا ڈالا ہے۔ بیماری، بیکاری، سماجی لعن طعن معاشرے کی بے حسی نے ان کی کہانیوں کو اداس کر ڈالا ہے۔ خواجہ احمد عباس ''چاند بجھ گیا'' کہ دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''سرلا کی اکثر کہانیوں پر ایک عمیق اداسی چھائی رہتی ہے وہ کالج کی فیشن ایبل لڑکیوں کے رومان قلم بند نہیں کرتی اس کے افسانوں میں نہ حجاب امتیاز علی کے 'اطالوی دریچے ہیں' نہ قرۃ العین حیدر کا 'کافی ہاؤس میں خوش گپیاں کرنے والے بے فکروں کا ہجوم ہے،' اس کے ہاں تو عصمت چغتائی کا بے پناہ 'نشتر جیسا تیز طنز بھی نہیں ہے جو سماج کے پھوڑوں کی چیڑ پھاڑ کرتا ہے' سرلا جراح نہیں ہے مقرر ہے اس کے افسانے سماجی اور نفسیاتی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں، ان میں آپ کی نعروں کی گونج نہیں ملے گی مگر اس کے افسانے پڑھ کر آپ اکثر انقلابی نعروں کے اصلی معنی سمجھ سکیں گے۔''

(چاند بجھ گیا صفحہ نمبر 3)

ٹھیک اسی طرح ان کا ایک مشہور افسانہ ''نیا جنم'' انسانی جذبات و مسائل کی کشمکش لیے ہوئے، بہترین افسانہ ہے، جو اسلوب، انداز بیان اور ہیئت کے اعتبار سے ایک نیا احساس اور انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ افسانہ نیا جنم میں سرلا دیوی نے جو تصویر پیش کی ہے وہ ہمارے معاشرے کا عکس ہے۔ افسانے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے زندگی کو بڑے ہی قریب سے گہری اور حساس نظروں سے دیکھا ہے۔ افسانے کی ابتداء میں جو ماحول پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے اندر بے چینی اور تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔ ''ناری اپنے پتی کے انتم درشن کر لے'' ------ اور یہ کہہ کر

اچارج نے لیلا کے پتی کے منہ سے کفن اٹھا دیا لیلا سے اس کا چہرہ دیکھا نہ گیا اس نے آنکھیں موند لی اچارج پھر بولا ناری اپنے پتی کو انتم نمسکار کر اور لیلا کو عورتوں نے سہارا دے کر چتا کے سرے پر کھڑا کر دیا۔'' افسانے کے آغاز میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ افسانہ انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کی ایک مطرب کہانی ہے۔ کہانی کی ابتداء چونکا دینے والی اور قاری کو باندھ لینے والی ہے۔ لیلا اپنے شوہر سے بے انتہا محبت کرنے والی ایک وفا شعار بیوی ہے سچ دیو بھی لیلا سے شادی کے ابتدائی دنوں میں خوب محبت لٹاتا ہے تبھی تو لیلا انتہائی کرب کے عالم میں کہتی ہے: ''سچ دیو تو ایسا نہ تھا وہ زندگی کے حالات پر تعجب کر رہی تھی زندگی جو اتنی خوبصورت ڈھنگ سے شروع ہوئی تھی اتنے بھیانک انجام تک کیسے پہنچ گئی کیا مسکراہٹیں اور محبت کی قسمیں اتنے جھوٹ اتنے عیبوں کو چھپا سکتی ہے۔''

لیلا جب اپنے خوبصورت دنوں کو یاد کرتی ہے تو اسے یقین نہیں آتا کہ جو زندگی اتنی حسین تھی اچانک سے اتنی تنگ، بیرنگ اور بناوٹی کیسے ہوگئی لیلا نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ سچد یو کرتا کیا ہے،؟ اس کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟ اتنا جانتی تھی کہ سچ دیو کی کاپی کتابوں کی ایک خاندانی دکان ہے جس سے گھر کا خرچ آسانی سے چل جاتا ہے وقت گزرتا رہا زندگی گزرتی رہی لیلا ایک بچی کی ماں بن گئی تب ہی اس نے محسوس کیا کی سچد یو کچھ پریشان اور اکھڑا اکھڑا سا رہتا ہے لیکن اس نے لیلا کی دیکھ بھال میں کوئی کمی نہ کی ....لیکن جب سچ دیو لیلا کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آتا ہے اور کئی مہینوں تک اسے لینے نہیں جاتا ہے تب وہ پریشان ہو جاتی ہے اور وہ ایک دن اچانک سچد یو سے ملنے چلی آتی ہے۔۔۔۔۔ اور جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکتا ہے کی سچ دیو کے گھر کی نیلامی ہو رہی تھی، لیلا یہ دیکھ کر تڑپ جاتی ہے ڈونڈی کی آواز نے جیسے لیلا کی دنیا کی دیوار ہلا ڈالی، اسے لگا جیسے بھونچال آ رہا ہے اور وہ پھٹتی ہوئی دھرتی پر جان بچانے کے لیے بھاگتے پھر رہی ہے " آہستہ آہستہ گھر کی ہر شے نیلام ہو جاتی ہے سچ دیو اپنے شرابی دوستوں کے ساتھ جوئے میں سب کچھ ہار جاتا ہے اور اب تو وہ لیلا کے زیور کپڑے برتن اور گھریلو ضروری سامان کو بھی جوئے میں ہار جاتا ہے اور لگاتار لیلا سے جھوٹ بولتا رہتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد جب پیسے کی تنگی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو وہ کھلے عام اس کے ساتھ مار پیٹ کرتا ہے اور شراب میں غرق ہو جاتا ہے۔

سرلا دیوی نے انسانی نفسیات کا جائزہ بڑی چابک دستی کے ساتھ لیا ہے پورا افسانہ آغاز سے انجام تک اپنے اندر تجسس لیے ہوئے ہے لکھتی ہیں لیلا بہت روئی بہت پیٹی اس نے گھر کی باقی چیزوں کو بکتے ہوئے دیکھا سچد یو نے اسے پیٹا تین دن تک گھر میں فاقہ رہا۔۔۔۔۔۔۔۔ایک لمحے کو لیلا سوچتی ہے کہ وہ جوئے کی کمائی نہ کھائے گی، مگر بھوک انسان کی غیرت اور خودداری کو مٹا دیتی ہے اور آخر کار وقت کے ساتھ لیلا بھی سچ دیو کی سازش کا شکار ہو جاتی ہے اور کہتی ہے: ''بھوکوں تو نہیں مرا جائے گا جو کچھ گنوایا ہے وہ تو لوٹایا جائے گا جس طرح بھی ہو جیسے بھی ہو۔''

''سچ دیو کی وہ سونے کی مورت پل بھر میں جل کر سیاہ ہوگئی
محبت اور یقین اور وشواش کی دنیا جل کر راکھ ہوگئی اور لیلا نے
جب اس راکھ کو ٹٹول کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اب کچھ نہیں
بچا ہے۔'' (صفحہ نمبر 181)

یہ ہمارے سماج کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ آج کا انسان نئے نئے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو کر خود فریبی اور خود غرضی کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو کسی زخم سے کم نہیں ہوتے پورا افسانہ ایک چبھتا ہوا سوال ہے، ایک کرب ہے ہمارے معاشرے کا ہزاروں سال سے عورتوں کا استحصال ہوتا رہا ہے جو اس کرب کو جھیلتے ہوئے خاموشی سے زندگی کو تباہی کی راہ پر ڈال دیتی ہیں۔

افسانہ اگے بڑھتا ہے لیلا سارے محلے میں بدنام ہو جاتی ہے وہ خود بھی محلّہ داروں سے سبھی چیزیں ادھار مانگتی رہتی ہے اور اپنی بیٹی کو بھی اس میں لگا دیتی ہے اس کی سونا سی آبرو خاک میں مل جاتی ہے اور بے حیائی کر لیتی ہے۔ دراصل یہ بے حیائی ہمارے فرسودہ اور بناوٹی نظام کی بے حیائی ہے جہاں شوہر کی نالائقی اس کی بیوی یا بیوہ کے نام لکھ دی جاتی ہے اور ساری زندگی اس کی اذیت میں گزرتی ہے۔

آخر کار سچد یو کا شراب پیتے ہوئے ایک گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ لیلا یہ چوٹ برداشت نہیں کر پاتی اور جب اس کا انتم سنسکار کر کے لوٹتی تو اسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک بھیانک خواب تھا جو ختم ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ایک کانٹا تھا جو نکل گیا اور تب ہی بے اختیار اس کو محسوس ہوا آج میرا ''نیا جنم'' ہوا ہے۔

☆☆☆

Razia Parveen
Assistant Prof.
(Department of Urdu)
Government Girls P.G College
Rampur, U.P-244901
Phone:9457387505

گلفشاں انجم

منفرد خاکہ نگار شوکت تھانوی

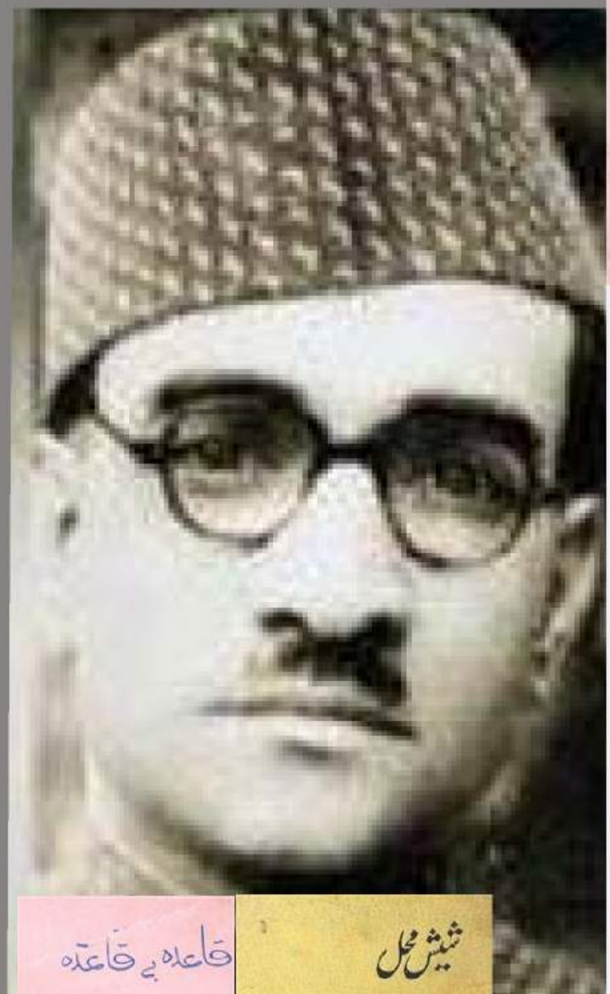

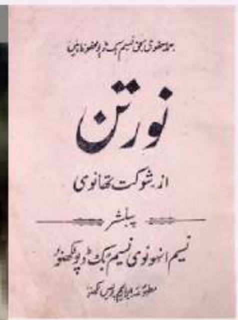

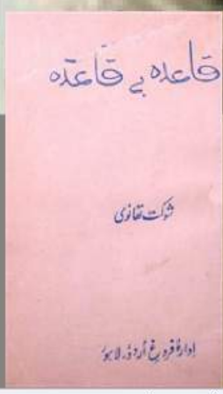

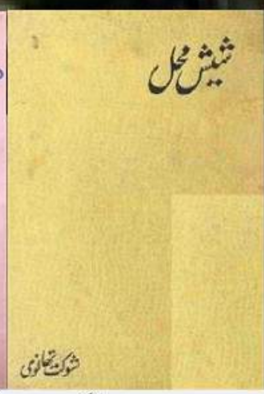

اردو کے نامور خاکہ نگار مزاح نگار شاعر اور صحافی جناب شوکت صدیقی 2 فروری، 1904 کو پیدا ہوئے۔شوکت صدیقی کا اصل نام محمد عمر تھا اور ان کا آبائی وطن تھانہ تھا اس نسبت سے انھوں نے جب شوکت قلمی نام رکھا تو وطن کی مناسبت سے اس پر تھانوی کا اضافہ کیا۔14 مئی، 1904 کو شوکت تھانوی کا انتقال ہوا۔ان کے والد کا نام صدیق احمد تھا، یہ لکھنؤ کے محکمۂ پولیس میں ملازم تھے لیکن شوکت تھانوی کی پیدائش کے چند دنوں بعد وہ بھوپال آگئے جہاں وہ میونسپل کے سرکاری چیئر مین ہوئے اور پھر منتظم پولیس کے عہدے پر فائض ہوئے۔صدیق احمد کی چار اولادیں تھی جن میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں شوکت صدیقی کا تعلیمی سلسلہ دیر سے شروع ہوا چونکہ یہ بچپن میں بیمار رہتے تھے ابتدا میں ایک ماسٹر صاحب گھر پر تعلیم دینے کے لیے آتے تھے لیکن جیسے ہی ان کے والد کو ماسٹر کے غلط تلفظ کا علم ہوا تو انھوں نے استاد کی چھٹی کر دی اور بھوپال کے ہائی اسکول میں انھیں داخل کرا دیا۔اس کے بعد والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت چھوڑ دی اور لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ یہاں آکر کچھ عرصہ ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع رہا وہ ایک طویل عرصے تک لکھنؤ میں مقیم رہے۔لکھنؤ میں اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کے باعث انھوں نے میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی اسکول چھوڑ دیا اس کے بعد ان کے والد علی گڑھ چلے گئے اور انھوں نے شوکت تھانوی کو بھی وہیں بلا لیا تا کہ وہ یہاں کے ماحول سے مانوس ہو جائیں اور پڑھنے لکھنے میں دلچسپی پیدا ہو مگر ان کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہونے سے قبل ہی ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

شوکت تھانوی کو شروع سے ہی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بہت شوق رہا ہے اس کا ان کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1920 میں وہیں سے ہو گیا تھا۔شوکت تھانوی گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔اس زمانے میں وہ اپنے اسکول کے ساتھیوں کے لیے قلمی رسالہ نکالتے تھے چونکہ ان کی تعلیم کا سلسلہ جلد ہی منقطع ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے کم عمر میں ہی شادی کر لی تھی۔

شوکت صدیقی ایک بلند پایہ مزاح نگار، اچھے صحافی اور شاعر تھے۔ مزاح ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ انھوں نے خاکہ نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے شوکت تھانوی نے صرف شخصی خاکے ہی تحریر کیے ہیں "شیش محل" کے خاکوں کے بارے میں شوکت تھانوی اپنی رائے دیتے ہیں کہ:

''یہ تذکرہ کسی مورخ کے کام آنے والی چیز یں نہیں ہے اس لیے کہ ادبی حالات سے زیادہ نجی حالات پیش کیے گئے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ ان کے غلط ہونے کا احتمال صحیح ہونے سے کہیں زیادہ ہے اس لیے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرا ذاتی مطالعہ ہے اور مجھ کو اعتراف ہے کہ میں نے اپنے متعلق کو ہمیشہ غیر مستند سمجھا ہے''۔

(شوکت تھانوی، سید مرتضی زیدی، ص22)

شوکت تھانوی کی تصانیف کی تعداد 70 کے قریب ہے جس میں ناول، افسانے، شاعری، خاکے، ڈرامے، اور مضامین وغیرہ شامل ہے شوکت صاحب کے خاکوں کے دو مجموعے ہیں جن کے نام ''شیش محل'' اور ''قاعدہ بے قاعدہ'' سنجیدہ مضامین کے ساتھ ''سرپنچ البم'' کے عنوان سے آٹھ تصویر قلم بند کی ہیں جس میں شاعر اور ادیب شامل ہے۔ تیسری کتاب ''نورتن'' ہے۔ اس میں تمام تر خاکے تعارفی ہے اور خاکے کا رنگ الگ ہے تمام ادبی شخصیتیں ہیں ان میں مشاہر بھی ہے اور گمنام بھی ان میں ہندو بھی ہے اور مسلمان بھی۔ شخصیتوں کا مطالعہ بڑی حد تک معروضی ہے اس مطالعے میں وسعت اور گہرائی نہیں ہے زندگی کا بیشتر حصہ چونکہ ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں گزرا اس لیے ان سے بے تکلف مراسم کی وجہ سے ان کے اچھے اور برے پہلوؤں سے واقف ہوئے اور خاکہ لکھنے کا محرک سے تعلق یا ان کا خلوص ہے۔

'شیش محل' کا پہلا ایڈیشن ایم ظہیر الدین پرنٹر و پبلشر نے دہلی محمدی پریس لاہور سے چھپوا کر اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور سے اگست 1943 میں شائع کیا اس کا دوسرا ایڈیشن نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے 1981 میں شائع ہوا شیش محل حرف تہجی کے تحت 112 شخصیات کو سمیٹے ہوئے 240 صفحات پر مشتمل ہے۔

'شیش محل' میں ان خاص و عام شخصیتوں کے خاکے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ادب اور شوکت تھانوی دونوں سے رہا ہے ان میں ادیب اور شاعر، صحافی ، ریڈیو، ڈرامہ نگار اور ناشر وغیرہ سبھی شامل ہیں جن سے شوکت تھانوی کے دوستانہ اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ 'شیش محل' میں پہلا خاکہ ''آرزو لکھنوی'' اور آخری خاکہ ''حکیم یوسف حسن'' کا ہے درمیان میں کئی خاص و عام شخصیتوں کے خاکے ہیں جن میں آسی الدین، آشفتہ لکھنوی، آغا شاعر، آغا حشر، آنند نارائن ملاّ، اثر لکھنوی، احسن مارہروی، احسان دانش، احتشام مائل، اختر شیرانی، ارشد تھانوی، اسلم، اصطفا لکھنوی، اصغر گونڈوی، پروفیسر اعجاز حسین، افسر میرٹھی، افقر موہانی، علامہ اقبال، اکبر حیدری، امید امیٹھوی، امین سلونوی، انیس احمد عباسی، انصار ناصری، اویس احمد ادیب، بسمل الہ آبادی، بہزاد لکھنوی، پریم چند، پطرس بخاری، پیارے لال شنکر، سید امتیاز علی تاج، تاجور نجیب آبادی، تبسم نظامی، ثاقب لکھنوی، جالب دہلوی، جاں نثار اختر، معین احسن جذبی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، حافظ محمد عالم، حب، حسرت موہانی، حسن نظامی، حفیظ جالندھری، حفیظ سید، خلیل احمد، خمار بارہ بنکوی، دیا نرائن نگم، دیوانہ بریلوی، دیوانہ گورکھپوری، خواجہ مسعود علی ذوقی، ن م راشد، راز چاند پوری، رام بابو سکسینہ، رحم علی الہاشمی، رشید احمد صدیقی، رشید جہاں، رضا خان، رفیع احمد خان، روش صدیقی، ریاض خیر آبادی، زاہدہ خلیق الزماں، ساغر نظامی، عبدالمجید سالک، سائل دہلوی، سبط حسن سپرو، سجاد حیدر یلدرم، سہا مجددی، سیدہ سردار اختر، سیماب اکبر آبادی، شاد، شاہد احمد، شمس الدین، شہید مولانا صبغتہ اللہ فرنگی محل، صادق بہار چرن سکسینہ، صدیق، صفدر مرزا پوری صفی لکھنوی، ظریف لکھنوی، ظفر الملک علوی، مولوی عبدالحق، عبدالحلیم شرر، عبدالرؤف عشرت، سر عبدالقادر، عبدالماجد دریا آبادی، عزیز لکھنوی، عشرت رحمانی، عظیم بیگ چغتائی، علی سردار جعفری، علی عباس حسینی، فانی بدایونی، فرید جعفری، فراق گورکھپوری، ابن الحسن فکر، قدیر لکھنوی، کرشن چندر، کلیم، اسرار الحق مجاز، مجذوب، مجنوں گورکھپوری، محبوب طرزی، مخدوم محی الدین، مرزا محمد حسن عسکری، مشیر احمد علوی، ملاّ رموزی، ملک حبیب احمد، نسیم انہونی، نیاز فتح پوری، وصل بلگرامی، یوسف حسن وغیرہ شامل ہیں۔

شوکت تھانوی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ''قاعدہ بے قاعدہ '' ہے اس کا پہلا ایڈیشن محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے فردوس پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا اس پر ایڈیشن بار اول درج ہے لیکن سن اشاعت درج نہیں ہے اسی کا دوسرا ایڈیشن نیو تاج آفس پوسٹ بکس دہلی سے شائع ہوا اس پر بھی سن اشاعت درج نہیں ہے مجموعے کے شروع میں عرض مصنف سے قبل ابتدائیہ ہے جسے محمد طفیل نے لکھا ہے ابتدایہ کے متعلق واضح ہوتا ہے کہ شوکت تھانوی نے جب خاکہ لکھ کر یہ مجموعہ تیار کیا تو اس وقت یہ مجموعہ شائع نہیں کیا بلکہ کچھ عرصے کے بعد منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ بھی شیش محل کی طرح حرف تہجی کے تحت مرتب کیا گیا ہے اس میں 31 شخصیات کے خاکے شامل ہیں جس میں 12 شخصیات کے خاکے شیش محل

میں بھی مذکور ہے۔

ان کے خاکوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جس کردار کے بارے میں وہ لکھتے ہیں اس پر تھوڑا سا طنز کر جاتے ہیں اس اعتبار سے ان کے خاکوں میں ہلکی سی دل شکنی ہوتی ہے لیکن ایک قسم کی رائے ضرور دیتے ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ رائے غلط بھی ہو شخصیتوں کے بعض پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے لکھتے ہیں کہ:

''عجب متضاد شخصیت عطر کی تجارت اور شاعری کا ذوق داڑھی اور نئے اسکیٹنگ میں اپنی نظیر آپ نماز اور روزہ بلیرڈ اور بیٹنگ، حج بھی خدا جانے کتنے بار کر چکے ہیں لندن بھی نہ جانے کتنی مرتبہ ہو کر جھکے تو واپس آگئے ہیں ادبی ذوق میں بھی تجارت کو دخل ہے لفظ فرماتے ہیں اور شعر ترنم سے پڑھتے ہیں۔'' (اردو ادب میں خاکہ نگاری، صابرہ سعید، ص216)

ان کے خاکوں میں صرف تحریر کا طلسم بولتا ہے اگر ہم ان کے خاکوں کے کسی خاکوں سے کسی کی سوانح میں مدد لینا چاہیے تو ہم کو کسی قسم کی مدد نہیں ملتی اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیات مزاح ہے۔ پطرس سے بے حد متاثر ہیں خود شوکت صاحب نے اقرار کیا ہے کہ مزاح میں اگر کہیں پطرس سے سرمو فرق نظر آئے تو آپ مجھ کو چور نہ سمجھیں قصہ دراصل یہ ہے کہ پطرس مجھ پر طاری ہو کر رہ گئے ہیں۔ شوکت صاحب کے تمام خاکے مزاحیہ انداز میں ہیں اس لیے ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی شخصیت کا مجموعی تاثر قبول کرنے کے علاوہ بات کہنے کے انداز سے محفوظ ہو جاتا ہے ڈاکٹر صابرہ سعید کا خیال ہے کہ:

''شوکت تھانوی کی تحریریں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا اولین مقصد قارئین کو ہنسانا ہے وہ ہنسانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کے جتنے پیرائے ہو سکتے ہیں وہ سب شوکت تھانوی کے پاس مل جائیں گے۔'' (اردو میں خاکہ نگاری، صابرہ سعید، صفحہ219)

شوکت تھانوی نے مزاح پیدا کرنے کے لیے لفظی بازی گری، فقرے بازی، اور پھبتی سے کام لیا ہے ذیل کی عبارتوں ہی سے اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں سید امتیاز علی تاج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلص مگر شعر نہیں کہتے تاکہ تخلص خرچ نہ ہو جائے اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسہ نہ جانے کب شعر کہنا پڑ جائے۔''

عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''نام تو عظیم بیگ تھا مگر اس قدر کمزور اور دبلے پتلے تھے کہ یہ نام پھبتی معلوم ہوتا تھا۔''

شوکت تھانوی بعض اوقات ایک ہی جملے میں اتنی بڑی بات کہہ جاتے ہیں کہ پوری شخصیت کا پھیلاؤ اس میں سما جاتا ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ بابائے اردو مولانا عبدالحق ہیں ڈاکٹر بھی ہیں مگر علاج صرف اردو کا کرتے ہیں۔''

ان کی تحریر اپنی شگفتگی کی وجہ سے مطالعہ کے قابل ہوتی ہے۔ جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہے اکثر جگہ مکالموں سے کام لیتے ہیں طنز کرتے ہیں لیکن انداز ایسا ہے کہ کسی دل آزاری نہیں ہوتی۔ الفاظ پر پوری طرح قدرت حاصل ہے ان کی تمام تصویریں نامکمل ہیں بعض تصویریں یا تو بہت ہلکی ہیں یا تو بہت ہی شوخ اپنے قلم کی شگفتگی سے ہر تصویر کو رنگین بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

شوکت تھانوی کی شخصیت نگاری پر پروفیسر وقار عظیم کی یہ رائے ہے وہ لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک ان خاکوں کی ایک اہم خصوصیات ان کا وہ خلوص دیانتداری ہے جس کی بناء پر انھیں ترتیب دیا گیا ہے اس لیے ان میں کہیں کہیں قصیدے اور ہجو کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ اس سے قطع نظر ان کے مطالعے سے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ اور ان کی بعض کمزوریوں کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اچھائیوں اور برائیوں کا امتزاج انھیں مافوق الفطرت ہونے سے بچالیتا ہے۔'' (بحوالہ نقوش لاہور، شوکت نمبر، ص48)

شوکت صدیقی کی خاکہ نگاری کا جائزہ لینے کے بعد اور معروف نقادوں کی رائے کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ بحیثیت خاکہ نگار شوکت تھانوی نے اردو ادب کی روایتی، تنقیدی یا جذباتی شخصیت نگاری کی عام روش سے ہٹ کر معیاری خاکے قلمبند کیے ہیں۔

□□□

Gulfeshan Anjum

Bhaji Mandi Near Mustaqeem Kirana store

Kamptee

Distt. Nagpur-441002 (M.S)

Mob : 7304597022

مہاراشٹر میں اردو ناول کی صورت حال

ڈاکٹر حبیب انساء بیگم سید یوسف علی

ناول ایک بے حد لچک دار اور بے انتہا وسیع صنف ادب ہے۔ ناول ایک ایسا نثری قصہ ہے جس میں ہماری حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ناول اطالوی زبان کے لفظ ''ناویلا'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں نیا۔ ناول اپنے عہد زندگی اور انسانی تجربوں کو فنی سلیقے سے پیش کرنے کا فن ہے۔ بقول قمر رئیس:

''ناول کا فن زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے''۔

مختلف ناقدین نے ناول کی تعریف الگ الگ انداز میں کی ہے۔ بقول فیلڈنگ:

''ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔''

ناول میں حقیقت کو تخلیق کا روپ دے کر یا تخلیق کو حقیقت کا جامہ پہنا کر اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ قصے کی حیثیت سے اس کے تمام اجزا میں ہم آہنگی قائم رہتی ہے۔ ناولٹ بھی ناول ہی کی ایک قسم ہے۔ اس میں صرف طوالت کا فرق ہے۔ ایک کامیاب ناول کے لیے ضروری ہے اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔

مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اردو میں ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ مولوی نذیر احمد نے کل سات ناول لکھیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور محمد علی طبیب نے تاریخی اور معاشرتی ناول لکھ کر اسلام کی تاریخ کو دہرایا۔

مہاراشٹر میں جن ناول نگاروں نے اردو ناول نگاری کے فن کی آبیاری کی ان میں ڈاکٹر سلیم خان، نورالحسنین، قاضی مشتاق احمد، رحمان عباس، علی امام نقوی، صادقہ نواب سحر، سلیم شہزاد، وکیل نجیب، انور خان، ابراہیم اختر، احمد عثمانی، ایم مبین اور نسرین رمضان کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ مقالہ میں ناول نگار کا مختصر تعارف اور ان کے ایک ایک ناول کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم خان: ڈاکٹر سلیم خان 19 نومبر 1956 کو مہاراشٹر کے شہر ممبئی میں پیدا ہوئے۔ آپ مہاراشٹر کے نہایت زود نویس ادیب ہیں۔ آپ نے کل پندرہ ناول الگ الگ عنوانات سے تخلیق کیے ہیں جن کے نام ''سکندر کا مقدر، بھیڑیا بھڑیا، بندر نما قلندر، زر پرست سر پرست، مہر وفا، فقر و غنا، بیم و رجا، صدق و صفا، قدر و قضا، وہم زاد جیتو جلاد، رشتے ناطے، تابوت، آتشِ صلیب، راجدھانی ایکسپریس اور تازہ ترین ناول بھیکو کسان کا بھارت مہان۔ ناول نگاری میں آپ کا ذہن بڑا زرخیز ہے۔ ڈاکٹر سلیم خان کا اسلوب تحریر سادہ اور سلیس ہے۔ وہ صاف

ستھری زبان استعمال کرتے ہیں۔تشبیہات اوراستعاروں کا بے جا استعمال نہیں کرتے جس سے تحریر میں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔ بیانیہ پر ان کی مکمل گرفت ہے۔ بناوٹ اور تصنع سے پاک عام فہم اندازِ بیان استعمال کرتے ہیں ۔ان کا مشاہدہ گہرا اور مطالعہ وسیع ہے وہ ایک تجربے کار شخصیت کے مالک ہیں۔ بے باک انداز ان کے اسلوبِ تحریر کی اہم خوبی ہے۔ان کے تخلیقی موضوعات بھی مصنوعی یا خیالی نہیں ہوتے بلکہ ہمارے معاشرے سے ہی لیے گئے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم خان کا تازہ ترین ناول ''بھیکو کسان کا بھارت مہان'' اپنے عنوان کے مطابق واقعی عصرِ حاضر کی المناک داستان ہے۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول داستان کی شکل میں حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ اکیسویں صدی کا ایک نمائندہ ناول ہے۔اس میں وہ سب کچھ ہے جو عصرِ حاضر میں ہورہا ہے۔اس ناول میں جن موضوعات کو چھیڑا گیا ہے وہ انتہائی سلگتے ہوئے مسائل ہیں۔''بھیکو کسان کا بھارت مہان'' ایک مکمل سماجی وسیاسی ناول ہے ۔اس میں لو جہاد، موب لنچنگ، سوشل میڈیا، گئورکشا، فرقہ پرستی،فسادات، سیاسی ہتھکنڈے، خون وقتل، نوٹ بندی، سیاسی نعرے، مکاریاں ، انسانیت وامن کی خاطر لڑائی اور انصاف وسچائی کے لیے موت کو گلے لگانے کے واقعات درج ہیں۔ یہ ناول ایک ایسی داستان ہے جس میں کئی واقعات ہیں جنھیں سو سے بھی زیادہ اہم وغیر اہم کرداروں کے سہارے بیان کیا گیا ہے

نورالحسنین: نورالحسنین 19 مارچ1950 کو اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ مہاراشٹرا کے ناول نگاروں میں ایک مشہور ومعروف نام ہے۔آپ بحیثیت مصنف، افسانہ نگار، ناول نگار ، تنقید نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔آپ کے چار ناول شائع ہوکر قارئین سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں جن کے نام کچھ اس طرح ہے۔آہنکار، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ ،چاند ہم سے باتیں کرتا ہے اور تازہ ناول تلک الایام ۔

ناول''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' ہندوستان کے علاوہ پاکستان کینیڈا، جرمنی اور برطانیہ میں بھی بے حد پسند کیا جارہا ہے۔ یہ نورالحسنین کا اک طویل رومانی ناول ہے۔اس ناول کا وقفہ بھی بہت طویل ہے۔یہ ناول 500 قبل مسیح سے اکیسویں صدی تک کا احاطہ کرتا ہے۔اس ناول کے ذریعے نورالحسنین نے ساری دنیا کی سیر کرائی ہے۔اس میں ہر زمانے کے حالات اور واقعات رقم کیے گئے ہیں۔ناول''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' کا شمار اردو کے شاہکار ناولوں میں ہوسکتا ہے۔ساڑھے چار سو صفحات کا احاطہ کرنے والے اس ناول میں ساری دنیا کی مشہور ومعروف عشقیہ داستانوں کو دلفریب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔''چاند'' جو تمام عشقیہ داستانوں کا گواہ ہے، ساتھی ہے رومان پرور ہے۔اس ناول کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔عشق لافانی ہے یہ صرف جسم ہی نہیں روحوں کو بھی بدلتا ہے کبھی فنا نہیں ہوتا۔اس کا آغاز اس وقت سے ہے جب سے انسان کو بنایا گیا۔ناول کا آغاز بہت عمدہ ہے۔عشق خود اپنے بارے میں کہتا ہے۔

''میں عشق ہوں، میں خالق کا کرشمہ ہوں، جنوں میرا مزاج،
وفا اگر میری سلطنت ہے تو سرکشی اور بغاوت میری صفت،
میں ازل سے ہوں اور ابد تک باقی رہوں گا۔''

(نورالحسنین، چاند ہم سے باتیں کرتا ہے، عرشیہ پبلیکیشن دہلی، ص15)

اس ناول کی تخلیق کے تناظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نورالحسنین اردو کے صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں شامل ہوگئے ہیں۔

قاضی مشتاق احمد: قاضی مشتاق احمد اردو ادب کے جانے مانے قلم کار ہیں۔آپ 20 مارچ 1940 کو جلگاؤں میں پیدا ہوئے۔آپ افسانہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار، رپورتاژ نگار اور سفر نامہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔آپ نے آزادی، سہمی ہوئی بہار ، فٹ پاتھ کی رانی ، درد کا پیوند اور شہزادہ جیسے ناول لکھ کر اردو ناول نگاری میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

''آزادی'' ایک تاریخی ناول ہے جس میں 1920 سے لے کر آزادی کے چند برس بعد تک کے واقعات کا بیان ہے۔اس ناول کو پڑھ کر حب الوطنی کا جذبہ دلوں میں جاگ جاتا ہے۔ناول کی کہانی بہت عمدہ اور دلوں میں گھر کرنے والی ہے۔ناول کی کہانی ہندوستان کے ایک دیہات کی کہانی ہے جس کا ایک پورا خاندان آزادی کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

رحمان عباس: رحمان عباس کا شمار بھی مہاراشٹرا کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ رحمان عباس 30 جنوری کو گوہا گر کوکن میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے چارناول تخلیق کیے ہیں جن کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ ''نخلستان کی تلاش، ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، خدا کے سائے میں آنکھ مچولی اور روحزن''۔

''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' کوکن کے تاریخی وسماجی پس منظر میں لکھا گیا ایک پراثر ناول ہے۔ اس ناول میں کوکن اور اس کے اطراف کے مختلف علاقوں اور دیہاتوں کی تہذیب، ثقافت اور رسم رواج کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی زندگی کے سماجی، سیاسی، مذہبی شعبہ حیات کی تلخ حقیقتیں بڑی بے باکی سے پیش کی گئی ہیں۔ اس ناول میں ناول نگار نے نہ صرف ممنوعہ محبت بلکہ کئی ایسی مذہبی اور سماجی روایات کا ذکر بھی کیا ہے جو عام طور پر ممنوعہ سمجھے جاتے ہیں۔ یا پھر ان کا یوں بے باکی سے ذکر کرنا ہمارے سماج میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ناول میں جو موضوع پیش کیا گیا ہے وہ قاری کو غور وفکر کرنے اور سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ناول میں نوجوانی کی نفسیات اور بے اولاد عورت کے جذبات، احساسات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ بقول ناول نگار:

> ''سکینہ کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری، اس نے کہا، ارے عزیز تو یہاں سوسکتا ہے۔ اتنا کہتے ہوئے وہ ذرا سرک گئی۔ سکینہ نے اس سے کہا کہ باہر سے چاند کی روشنی کمرے میں آرہی ہے بتی بجھادو۔ اس نے سکینہ کے فرمان کے مطابق بتی بجھادی اور بستر پر لیٹ گیا''۔

(رحمٰن عباس، ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، عرشیہ پبلیکیشن دہلی، ص 144)

ناول نگار نے انتقام، نفرت، عزتِ نفس اور غیرت کی کیفیات کو بھی فن کارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

نذیر فتح پوری: نذیر فتح پوری مہاراشٹرا کے مشہور شاعر کے ساتھ ساتھ ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، مضمون نگار تبصرہ نگار، محقق اور صحافی بھی ہیں۔ ناول ''چٹانوں کے بیچ'' ان کی پہلی کاوش ہے جو راجپوتوں کی کہانی پر مبنی ہے۔ اس ناول کا ہیرو امر سنگھ اور ہیروئین رجنی ہے۔ یہ ناول ان دونوں کی ریم کہانی رمبنی ہے۔ اس ناول کے عنوان رغور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ کہانی کے لحاظ سے اس سے بہترین اور کوئی دوسرا عنوان ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہیروئین کی پہلی ملاقات ہری مندر کے باہر چٹانوں کے بیچ ہوتی ہے۔ وہیں وہ ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ناول نگار کی پہلی کاوش ہے۔ نذیر فتح پوری نے کل چار ناول تخلیق کیے۔

علی امام نقوی: علی امام نقوی افسانہ نگار، ناول نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ علی امام نقوی کے دو ناول منظر عام پر آئے ہیں۔ پہلا ناول ''تین بتی کے راما'' اور دوسرا ''بساط''۔

ناول ''بساط'' کا موضوع سیاست ہے۔ علی امام نقوی نے اس ناول میں ممبئی، کشمیر کے علاوہ ہندوستان اور دوسرے کئی ممالک کے سیاسی حالات، تاریخی پس منظر اور سماجی حالات کی فلسفیانہ انداز میں منظر کشی کی ہے۔ ناول عصر حاضر کی صورت حال کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول ایک پختہ ذہن اور دانشور کی تخلیق ہے۔ اس میں واقعات کم اور فلسفہ زیادہ ہے۔ یہ ناول بیک وقت حقیقت کا عکاس بھی ہے اور غور وفکر کا طالب بھی۔ اس ناول میں کئی خوبیاں ہیں۔ مہاراشٹرا کے ناول نگاروں میں علی امام نقوی کا نام نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر: مہاراشٹرا کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا ہے۔ آپ 18 اپریل 1957 کو آندھرا پردیش کے ضلع گنٹور میں پیدا ہوئیں۔ ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'، جس دن سے اور تازہ

ترین ناول راجدیو کی امرائی'' جیسے ناول لکھ کر صادقہ نواب سحر نے اردو ناول نگاری میں گرانقدر اضافہ کیے ہیں۔

ناول ''جس دن سے'' آپ بیتی کی شکل میں ہے جسے مصنفہ نے بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول جدید دور کے متوسط طبقے کے خاندان کا المیہ ہے۔ جہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت کرنا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن جب عورت ملازمت کرتی ہے تو گھریلو امور اور اس کا خاندان متاثر ہونے لگتا ہے۔ یہ ناول آج کے معاشرے کا عکاس

ہے اور تمام تر فنی تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ ناول کا قصہ ایک متوسط مراٹھی خاندان سے شروع ہوتا ہے۔ قصہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ پلاٹ گھٹا ہوا اور مضبوط ہے۔ رشتوں کے تانے بانے کو بن کر مصنفہ نے بہت ہی بہترین انداز میں قصہ تیار کیا ہے۔ قاری کو کہیں بھی بوریت محسوس نہیں ہوتی یا کوئی بھی واقعہ قصے سے ہٹ کر نہیں لگتا۔

سلیم شہزاد: سلیم شہزاد کا تعلق مالیگاؤں سے ہے۔ آپ یکم جون 1949 کو پیدا ہوئے۔ آپ جدید لہجے کے شاعر، بے باک نقاد، لغت نویس اور ناول نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ آپ نے ''ویرگاتھا' دستِ آدم اور سانپ اور سیڑھیاں'' جیسے ناول لکھ کر اردو ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

''سانپ اور سیڑھیاں'' عالمی سطح کی مکروہ سیاست کی عکاسی کرنے والا ناول ہے۔ سلیم شہزاد نے ناول کا عنوان ''سانپ اور سیڑھیاں'' بہت سوچ سمجھ کر طے کیا ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سانپ اور سیڑھی وہ کھیل ہے جس میں کوئی نہیں جانتا کہ کب کس کے ہاتھ سیڑھی لگے گی اور کون کب سانپ کا شکار ہوگا۔ ناول نگار نے ناول کے تمام واقعات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کا اندازِ بیاں پیچیدہ اور فلسفیانہ ہے۔ اس میں پیش کیے گئے واقعات ہندی، گجراتی، بنگالی اور کنڑ، مختلف کرداروں کے ذریعے بہت عمدہ طریقے سے ناول نگار نے ترتیب دیئے ہیں جو ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بقول ناول نگار:

''کھیل ختم نہیں ہوا۔ کیوں کہ حقیقت باقی ہے اور باقی رہے
تو اس سے نئی کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔ سانپ اور سیڑھیاں
کھیلتے ہوئے یگ بیت گئے۔۔۔۔۔ بیتے جارہے ہیں۔''

(سلیم شہزاد، سانپ اور سیڑھیاں، منظر نما پبلیشر مالیگاؤں، ص 136)

اپنی خاصیت اور انفرادیت کی وجہ سے ناول ''سانپ اور سیڑھیاں'' مستقبل میں عالمی سطح پر چند منتخب ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

وکیل نجیب: وکیل نجیب انتہائی پختہ ذہن، طویل تجربہ رکھنے والے قلم کار ہیں۔ آپ کی پیدائش یکم جولائی 1946 ہے۔ ان کی اب تک 30 سے زائد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ وکیل نجیب نے بچوں کے لیے زیادہ لکھا ہے۔ ''سیاہ رات'' بڑوں کے لیے لکھا گیا ناول ہے۔ اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ بے شمار واقعات کا مجموعہ ہے لیکن اس کے تمام واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ناول نگار نے موثر کہانی کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے مختلف گاؤں اور شہر کی بھی سیر کروائی ہے اور بہت عمدہ منظر کشی کے نمونے پیش کیے ہیں۔ جیسے:

صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ندی کی نمی ریت میں
محسوس ہو رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ نے
ماحول میں ہلکی سی موسیقی چھیڑ دی تھی۔

(وکیل نجیب، سیاہ رات، رحمانی پبلیکیشن، مالیگاؤں ص 20)

وکیل نجیب کا بیانیہ طریقہ انتہائی باریک بینی سے واقعات کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور دلچسپی کو آخر تک قائم رکھتا ہے یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ اس ناول میں اپنے وقت کے سیاسی، سماجی، تاریخی، معاشی اور اخلاقی حالات کے نہایت عمدہ بیانات و واقعات ملتے ہیں۔

انور خاں: انور خاں یکم مارچ 1942 کو ممبئی میں پیدا ہوئے اور 4 ستمبر 2001 کو وفات پا گئے۔ انور خاں افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ''پھول جیسے لوگ'' ناول لکھ کر ناول نگاری کی تاریخ میں اپنا نام درج کروایا ہے۔ یہ ایک سماجی ناول ہے، جس میں اپنے دور کے حالات اور فلمی دور کی سچائیوں کو کہانی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول کی کہانی مرکزی کردار کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ ناول دلکش، موثر اور سبق آموز ہے۔ اس ناول میں رومانس بھی ہے اور خوشیوں کے لمحات بھی ہیں اور غمگین حالات بھی خودغرضیاں، مکاریاں، چالاکیاں اور قربانیاں بھی۔ جیسا کہ اس کا عنوان ہے ''پھول جیسے لوگ'' اس ناول کے مختلف کردار ماں، بہن، محبوبہ بھائی، دوست، غرض کچھ لوگ ہیں جو اپنے کردار کے ذریعے خود کو پھول ثابت کرتے ہیں اور کچھ لوگ کانٹوں کی طرح چبھنے والے بھی ہیں۔

اچھائی، بُرائی ہمیشہ ساتھ چلتی ہے۔ انسان کبھی اچھائی کی جانب راغب ہوتا ہے تو کبھی بُرائی اس پر حاوی ہو جاتی ہے لیکن کبھی کبھی انسان اچھائی اور بُرائی کی کشمکش میں پھنس جاتا ہے اور فیصلے کرنے میں دیر کر دیتا ہے اور نفسیاتی و دماغی مریض بن جاتا ہے۔

ابراہیم اختر: ابراہیم اختر 1935 کو ضلع پربھنی میں پیدا ہوئے۔ ابراہیم اختر نے ''خاک ہوجائیں گے ہم اور سرِ دار'' نام سے دو ناول اور ایک ''پیاسِ دل'' ناولٹ لکھا ہے۔ ناول ''خاک ہوجائیں گے ہم'' حقیقی واقعہ پر مبنی ہے۔ صنوبر اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو معلّمی کے پیشے سے وابستہ ہے۔ یہ ناول ایک ایسی لڑکی کا المیہ ہے جس کی اپنی زندگی اپنی نہ تھی۔ وہ دوسروں کے لیے جیتے جیتے خاک ہوگئی۔ صنوبر اپنے حصے کی ہر خوشی دوسروں کے لیے قربان کر دیتی ہے۔ اپنی ہر خوشی کا گلا گھونٹ کر اپنے اندر درد و کرب کو دل کے قبرستان میں دفن کر دیتی ہے۔ یہ ناول سماج کے اس طبقے پر طنز کرتا ہے جو اپنی نام نہاد عزت اور ناموس کے محل کو دنیا کے

سامنے کھڑا رکھنے کے لیے ہر جائز ناجائز کام انجام دیتے ہیں۔ بظاہر سفید پوش نظر آنے والا یہ محل اندر سے کھنڈر ہوتا ہے لیکن سماج کے سامنے اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے سیاہ وسفید کا سہارا لیا جاتا ہے موجودہ حالات کی کشمکش میں سلگتا ہوا یہ ایک بہترین ناول ہے یہ ناول واقعی میں قاری کے دل ودماغ پر اثر کرتا ہے۔

احمد عثمانی: احمد عثمانی 7 جون 1943 میں کھوپر گاؤں دانہ پور تعلقہ بھوکر دن ضلع جالنہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ماہ نامہ ''بیباک'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اردو ادب کی خدمات انجام دے رہیں۔ احمد عثمانی "زندگی تیرے لیے" تخلیق کر کے ناول نگاروں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ احمد عثمانی کا یہ ناول مہاراشٹر کی دیہاتی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں ہندوستان کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو ایک بستی گاؤں اور شہر میں ہوتا ہے۔ ناول میں سماج اور سیاست کی موجودہ صورت حال کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرح مہاراشٹر میں بھی دیہاتوں کی کثرت ہے۔ احمد عثمانی صاحب کا یہ ناول مہاراشٹر کی تہذیب وقبیلہ جاتی پس منظر کا عکاس ہے جو اپنے آپ میں پہلا اور دلچسپ ناول ہے۔ ناول نگار نے بڑی بے باکی سے سماجی زندگی کے پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ناول نگار کی ہر طبقے کے حالات پر بڑی گہری نظر ہے۔ ان کی مشاہدے کی صلاحیت قابل داد ہے۔ یہ ناول خصوصاً مہاراشٹر کے قاری کے لیے ایک اچھی تخلیق ہے جس سے ہمیں اپنے اطراف کے حالات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔

ایم۔مبین: محمد مبین کو ادبی دنیا میں ایم مبین کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایم مبین 2 جون 1958 کو ایوالہ ضلع ناسک میں پیدا ہوئے۔ ایم مبین بنیادی طور پر بچوں کے ادیب ہیں لیکن انھوں نے ''انگوٹھا'' اور ''کالا پانی'' کے عنوانات سے بڑوں کے لیے بھی دو ناول تخلیق کیے ہیں۔

''کالا پانی'' انڈومان کی سیلولر جیل کے پس منظر میں لکھا گیا ایک تاریخی ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع حب الوطنی ہے۔ اس ناول کے ایک ایک لفظ سے حب الوطنی کے جذبہ کی خوشبو مہکتی ہے۔ اس ناول کو سنجیدگی سے پڑھنے والا حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو جاتا ہے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے ہمارے ہندوستانیوں نے جو قربانیاں دی ہیں اس سے اچھی طرح آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں آزادی کی اہمیت وقیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس ناول کا سب سے اہم حصہ اس ناول میں شامل وہ بیانات ہیں جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کالے پانی کی سزا کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کون سی سزائیں تھیں جو اس قید خانے میں دی جاتی تھیں۔ یہ ناول خصوصاً نوجوان نسل کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔

نسرین رمضان: مہاراشٹر کی خواتین ناول نگاروں میں ایک نام نسرین رمضان کا بھی ہے جو شہر پونہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ نسرین رمضان نے دو ناول تخلیق کیے ہیں۔ ''دل کی گلی میں چاند اترا'' اور ''تیرے دل کے آشیانے میں''۔

''دل کی گلی میں چاند اترا'' ناول کے پیش گفتار میں خود مصنفہ لکھتی ہیں کہ یہ ناول انھوں نے دماغ سے کم اور دل سے زیادہ لکھا ہے۔ یہ ناول انھیں ایک خواب جیسا لگتا ہے۔ واقعی یہ مختصر ناول ایک عام عورت کے خواب جیسا ہے جو سیدھی سادی زندگی بسر کرتی ہے اور جس کے خواب حقیقی دنیا سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ شاید ہر عورت کے لیے یہ خواب مکمل بھی نہیں ہوتے لیکن ناول میں نشو کا شوہر اس کے ہر خواب کو پورا کرتا ہے۔ بقول مصنفہ:

> ''بتایئے تو صحیح۔۔۔ آپ کو میرے خوابوں کے گھر کے متعلق کیسے معلوم ہوا''۔
> ''بس معلوم ہو گیا''۔۔۔۔ مگر کیسے؟
> چاہنے والے اپنوں کی پسند، ناپسند، ان کی آنکھوں کے دریچوں میں پنپتے خواب، ان کے ارمان، خواہشات، حسرتوں کا پتہ لگا ہی لیتے ہیں۔

(نسرین رمضان، دل کی گلی میں چاند اترا، شارپ پریس مالے گاؤں ص 30)

مہاراشٹرا کے ان ناول نگاروں کی گہری نظر ہے۔ ہمارے یہ ناول نگار اپنے عصری تقاضوں کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور انھیں روح عصر کو ناول کے قالب میں ڈھالنے کا فن آتا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی بیشتر ناول معیاری قرار دیے جا سکتے ہیں۔

مہارشٹرا کے یہ ناول نگار ناولوں کے ذریعے اردو ناول کے فروغ اور ارتقا میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مہارشٹرا میں ناول کے مطالعے کے بعد بلا تامل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مہارشٹرا میں اردو ناول کا مستقبل روشن ہے۔

□□□

Dr.Habibunnisa BegumYousuf Ali
Asistant Professor
Dept of Urdu
D.S M College
Parbhani-431401 (M.S)

عارف این

نگار عظیم کے افسانوں میں حقیقت نگاری مجموعہ 'عکس' کی روشنی میں

جدید خواتین افسانہ نگاروں میں نگار عظیم ایک اہم نام ہے۔نگار عظیم کا اصلی نام مہر نگار ہے۔وہ 9 ستمبر 1951 میں میرٹھ کی سرزمین پر پیدا ہوئیں۔ تعلیمی سفر کے دوران ہی ادبی ذوق وشوق بھی پیدا ہوا چونکہ گھر پر ادبی محفلوں کا اکثر انتظام ہوا کرتا تھا۔نگار عظیم کا شمار ہمارے عہد کی مشہور ومعروف خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے افسانے کی دنیا میں منٹو، بیدی، عصمت کی افسانوی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

انھوں نے افسانے کی دنیا میں افسانہ عقیدت کے آنسو لکھ کر 1973 میں قدم رکھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 1990 میں ''عکس'' کے نام سے شائع ہوا۔دوسرا مجموعہ ''گہن'' 1999 میں شائع ہوا۔تیسرا مجموعہ ''عمارت'' ہے جو 2010 میں شائع ہوا۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''عکس'' میں کل بیس کہانیاں شامل ہیں۔دوسرا مجموعہ ''گہن'' میں کل پندرہ افسانے ہیں۔آخری مجموعہ ''عمارت'' میں کل سترہ افسانے شامل ہیں۔

نگار عظیم نے موجودہ عہد کے مسائل، حالات اور پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں میں تصویر کشی کرنے کی کوشش کی اور جس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں سماج کی حقیقی تصویر کشی کی۔ ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر جمشید پوری لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نگار عظیم کی کہانیاں ہمارے سماج کے زخموں کا آئینہ ہیں۔''

نگار عظیم کے افسانوں میں سماجی اور گھریلو زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ان میں چند کہانیاں ہی سیاسی نوعیت کی ہیں۔ان کی کہانیاں رومان اور حقیقت کے درمیان کا سفر کرتی ہوئی حقیقت کے بالکل قریب پہنچ کر ایک ٹھوس نتیجہ اخذ کر لیتی ہیں۔عصمت چغتائی نے عورتوں کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا مرکز بنایا۔نگار عظیم نے بھی اسی راستے پر قدم رکھا جس سے وہ بنیادی طور پر متاثر بھی نظر آتی ہیں۔شیریں لب ولہجہ، سادہ اور عام فہم زبان کے ساتھ زندگی کی حقیقت کا بیان ہی ان کی انفرادیت کی پہچان ہے۔پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''وہ عصمت چغتائی کی طرح اپنے ماحول اور زندگی کی سچائیوں کو اس طرح ڈوب کر تیکھے شفاف اور بے باک لہجہ میں بیان کرتی ہیں کہ بعض لوگ سوچتے ہیں وہ کہانی نہیں لکھتیں خود کہانی انھیں لکھتی ہے۔''

نگار عظیم کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر متوسط طبقے سے جڑے ہوئے ہیں۔قدیم اور جدید نظریات کے بیچ پھلتے پھولتے رشتوں کو مرکز میں رکھ کر ان کی تحاریر معنی خیز شکل اختیار کرتی ہیں۔نگار عظیم نے اپنے دور کے معاملات ومسائل کو نہایت پختگی اور بالغ نظری کے ساتھ مشاہدہ کیا اور کشادہ دلی کے ساتھ سماج کے ان مسائل کو جدید نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔پروفیسر اسلم جمشید پوری ان کی کہانیوں

کے متعلق لکھتے ہیں:

''نگار عظیم کے افسانے ہمارے سماج کے واقعات وحادثات کا ایسا اظہار ہے جو کہانی کو پرتاثیر بنا دیتا ہے۔ان کے کردار زندہ جاوید انسان ہوتے ہیں۔جس کی کہانیاں نکلتی تو ضرور نگار عظیم کے قلم سے ہیں لیکن وہ ہم سب کی کہانیاں ہوتی ہیں۔''

نگار عظیم سماج کی گہری نبض شناس ہیں انھوں نے جو دیکھا سمجھا اور محسوس کیا اُسی حقیقت کو اپنے افسانوں میں تخلیق کیا۔مصنفہ خود لکھتی ہیں:

''میرا یہ خیال ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنے گردو پیش کے حالات اور سماجی انتشار سے بے چین ہو کر ہی قلم اٹھاتا ہے۔چنانچہ میری یہ کہانیاں بھی عام انسانوں کی زندگی،ان کے مسائل،الجھنوں اور محرومیوں سے جڑی ہوئی ہیں۔''

نگار عظیم کے افسانوں کے موضوعات نفسیات اور سماج پر مبنی ہو تے ہیں۔وہ اپنے بیشتر افسانوں میں نچلے متوسط طبقے کے مسلم سماج کی عکاسی کرتی ہیں۔وہ ترقی پسند تحریک سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔نگار عظیم کی کہانیوں میں شہروں کے متعلق مسائل زیادہ ہیں اور دیہات وقصبات کی کہانیاں نسبتاً کم ہیں۔رشتوں کی کہانیوں میں زیادہ تر بھائی بہن ماں باپ، بیٹا میاں بیوی وغیرہ عام ہیں۔عورتوں اور مردوں کے لیے ان کا رویہ زیادہ تر نرم وسادہ ہوتا ہے۔لیکن اس سادگی میں اثر انگیزی ہوتی ہے۔زیادہ تر کردار جدوجہد کرتے ہیں ایک دوسرے سے ہمدردی رکھتے ہیں۔کوئی انقلابی کردار وہ اپنی کہانیوں میں پیدا نہیں کر پاتی ہیں بلکہ ان کے کردار سماج کے بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے اصولوں پر چلتے رہتے ہیں۔

نگار عظیم کا مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ جذبات کے معاملے میں بیحد سنجیدہ اور حساس ہیں۔افسانوں میں تہذیبی عناصر جگہ جگہ ملتے ہیں اور ترقی پسند نظریات کی غمازی بھی ہوتی ہے۔ان کے افسانوں میں موجودہ دور کی زندگی کی حقیقت ہمیں نظر آتی ہے۔

نگار عظیم جنسی جانب داری کا شکار نہیں ہیں۔وہ عورتوں کی خرابیوں اور برائیوں سے بے باکی سے پردہ اٹھاتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ان کے افسانوں میں مردوں کی وضع کردہ سماج میں عورت کے استحصال اور اس پر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف احتجاجی رویے نظر آتے ہیں۔اپنے افسانوں میں نسوانی کرداروں کو اپنے حق کی ادائیگی کے لیے جدوجہد کرتے دکھایا ہے۔

مجموعہ ''عکس'' کی کل بیس کہانیوں میں زیادہ تر کہانیاں 80 کی دہائی میں جو مسائل پیش پیش تھے ان کی بہت سنجیدگی اور موئثر ڈھنگ سے عکاسی کی گئی ہے۔یہ تمام افسانے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔اس میں مرد،کسک،روشنی،بدلے کا سہاگ،فرق،ریڈ لائٹ،آدمی،فریڈم فائٹر،بھوک ان تمام افسانوں میں ہیں،جہیز کا مسئلہ ہے تو کہیں لڑکی سماج میں بوجھ بن جاتی ہے،کہیں وہ محنت کرتی ہے،کسی کہانی میں بھوک و افلاس ہے،کہیں مرد اور عورت کے رشتے ہیں۔غرض کہ نگار عظیم کے افسانوں میں ان سب کا ملا جلا روپ نظر آتا ہے۔نگار عظیم کے افسانوں میں حقیقت نگاری کی چند مثال ملاحظہ کریں۔

افسانہ ''بھوک'' میں نگار عظیم نے اس دور کے حالات اور واقعات کی عکاسی کی ہے جس کے مطالعہ سے انسانی ذہن خوب متاثر ہوتا ہے۔چونکہ افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں سماجی زندگی کی تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے۔افسانہ ''بھوک'' کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانی جسم کی بھوک انسان سے ایسے عمل کرواتی ہے جو آگے چل کر نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔اس افسانے میں ہسپتال کی تصویر کشی یوں کی ہے:

''کئی مرتبہ مجھے اس بات کا خیال ہوا کہ ہسپتال اور قبرستان دونوں جگہیں ایسی ہیں جہاں آکر انسان خدا اور موت دونوں کو یاد کر لیتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی نیک کام کرنے کا موقع مل جائے تو وہ چوکتا نہیں۔''

افسانہ ''روشنی'' ایک ایسی کہانی ہے جس کے نسوانی کردار سنیتا کا قد کم ہے اور ماں باپ غریب ہیں اور سنیتا قد کی کمی کی وجہ سے ناپسند کر دی جاتی ہے اُس کے بعد ایک لڑکا جو کپڑے کی دوکان میں کام کرتا ہے وہ سنیتا کو پسند کر لیتا ہے لیکن اُس کی شرط ہوتی ہے کہ لڑکی نوکری کرتی ہوئی ہو۔حالانکہ سنیتا کے والد سمجھاتے ہیں کہ سنیتا بی۔ایڈ ہے اور جلد نوکری مل جائے گی مگر وہ راضی نہ ہوا اور سنیتا کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔اُس نے اپنی ماں سے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

اسے محسوس ہوا کہ انھیں میری نہیں بلکہ ہر ماہ روپیہ لانے والی ایک عورت کی ضرورت ہے جسے وہ کئی استعمال میں لا سکتے ہیں۔بچے بھی پیدا کرے گی گھر بھی سنبھالے گی۔روپیہ بھی لائے گی۔پتی کی سیوا بھی کرے گی بعد میں چاہے حالات کے تحت اسے نوکری کرنا پڑتی۔اس نے ساری ہمت بٹور کر ماں کو اس رشتے کے لیے انکار کر دیا۔

افسانہ نگار موجودہ دور کے حالات کے کئی اہم مسئلے پر روشنی ڈالتی ہیں جہاں عورت کی کوئی عزّت نہیں اسے صرف استعمال کی چیز سمجھا جاتا ہے اور اس کے جذبے کو اس کے ماں باپ نہیں سمجھ پاتے اور بوجھ سمجھتے

ہیں وہ کسی بھی اور کیسے بھی لڑکے سے شادی کر کے اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہتے ہیں۔ افسانہ نگار کہانی کو صرف یہیں نہیں ختم کر دیتی بلکہ وہ زندگی میں ایک پیغام بھی دینا چاہتی ہیں کہ وہ دوسروں کو دیکھ کر خودکشی کا ارادہ ترک کر کے ایک نئی زندگی کی شروعات کرنا چاہتی ہے۔

افسانہ ''مرد'' ایک مظلوم لڑکی کی کہانی ہے۔ زمرد نامی لڑکی گھر میں ملازمہ ہے۔ وہ اشرف علی پر فریفتہ ہے لیکن اشرف علی اس کو بدنامی اور رسوائی سے بچاتے ہیں۔ اس کی شادی کہیں اور کرا دیتے ہیں افسانہ نگار نے اس میں اس بات کو پوشیدہ رکھا ہے کہ اشرف علی نے زمرد کو پہلے استعمال کیا پھر بعد میں مردانگی دکھائی ایک زوردار تھپڑ مار کر۔ دراصل مرد کا یہ تھپڑ عورت کی توہین ہے کیونکہ عورت اس مرد سے لڑ نہیں سکتی اپنی عزت کی خاطر خاموش رہ جاتی ہے۔ مرد ہزار برے کام کر کے بھی سماج میں سر اٹھا کر چلتا ہے کیونکہ وہ مرد ہے عورت کا سرپرست ہے اس کو مصنفہ کہانی کے آخر میں ثابت بھی کر دیتی ہیں۔

ایک اور افسانہ بدلے کا سہاگ ہے جس میں نریندر گپتا سرکاری ملازم تھے اور اپنے بچوں کو قلیل آمدنی میں پڑھایا لکھایا تھا اور اپنی لڑکی کے بڑے ہونے پر ایک رشتہ ایل۔ ایل۔ بی پاس لڑکے سے طے کر دیا تھا۔ مسئلہ صرف جہیز اور نقد روپیوں کا تھا۔ مردلا کے والد نے اپنی کڈنی بیچ کر شادی کے لیے آدھی رقم لا کر اپنی بیوی کو دی اور بیوی ان پیسوں سے جہیز کا سامان خریدنے لگی۔ وہ کانپور کا بہانہ کر کے گھر سے چلے گئے مگر وہ کانپور نہیں بلکہ اسپتال میں داخل ہو گئے تھے جب گھر والے اطلاع ملنے پر ان سے ملنے گئے ت تو وہ دم توڑ رہے تھے بعد میں یہ بات معلوم ہوئی کہ دراصل انھوں نے اپنی کڈنی بیچی تھی۔ جس نے خریدی تھی وہ بھی مر گیا اور جس نے بیچی وہ بھی۔

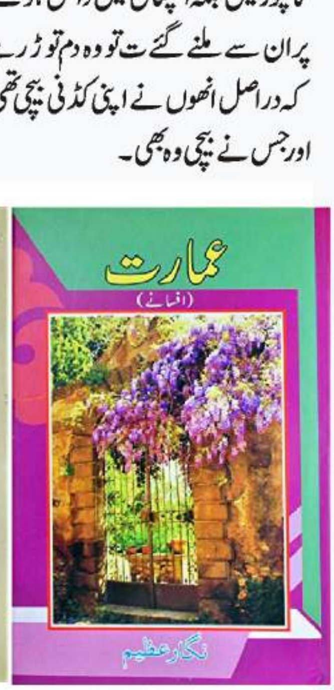

افسانہ بابا ایک ایسی کہانی ہے جو صرف انسانی رشتوں پر مرکوز ہے ایک خراب آدمی کو جو کوٹھے پر جاتا تھا جسے ایک بچی کی محبت بدل دیتی ہے اور اسے وہ اپنے گھر لے آتا ہے اور خود بھی برے کام چھوڑ دیتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے پھر اس کے بعد وہ اس لڑکی کی شادی کر دیتا ہے۔ اس زمانہ میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ اس کی مثال بھی نگار عظیم کے افسانہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

افسانہ زرد پتے ایسی دو بہنوں کی کہانی ہے جو ضد کی وجہ سے اپنی زندگی کو تباہ و برباد کر لیتی ہیں۔ اچھی سلیقے مند شمیم ایک شادی شدہ شیرو کباب والے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ یہ نہایت ہنرمند ہے مگر شیطانی حرکتوں کی بنا پر وہ زندگی تباہ کر لیتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد شیرو اس کے زیور کپڑے بیچ کر اسے واپس گھر بھیج دیتا ہے۔ والد اسی شرم اور غم میں رحلت کر چکے ہوتے ہیں۔ دوسری نسیم آرٹسٹ اپنے والد کے ایک ہندو دوست کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور بغیر شادی کے اُن کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ آج کے Living Together سسٹم کی بھی اس افسانہ میں تصویر کشی کی گئی ہے۔

افسانہ دوسرا قتل ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنا شوہر چھوڑ کر دوسرے نوجوان لڑکوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہے یہی اُس کا پیشہ ہے عورت کی بدکرداری کو افسانہ نگار نے اشاروں میں بیان کیا ہے۔

نگار عظیم کے مجموعہ عکس میں شامل یہ کہانیاں ان کے پہلے دور کی کہانیاں ہیں جب نگار عظیم کم عمر تھیں۔ رومانی احساس و شعور سے دوچار تھیں لیکن پھر بھی زندگی کے تئیں اُن کا جد و جہد سے بھرا رویہ ان کی کہانیوں میں کہیں شعوری اور کہیں لاشعوری طور پر سماجی جد و جہد اور معاشرتی وجدان سے مالا مال کر دیتا ہے اور کہانی رومانی ہو کر بھی حقیقت کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

□□□

Arif N
Research Scholar
Dept.of Urdu
Sree Sankaracharya University of Sanskrit
Regional Centre
Koyilandy
Calicut-673330 (Kerala)
Mob: 8089810461

مسائل نسواں کی ترجمان
اعجاز شاہین

ڈاکٹر عزیز احمد خان

اعجاز شاہین کا اصل نام اعجاز فاطمہ تھا۔ان کی پیدائش 17 جنوری 1940 میں ہوئی۔ تقریباً چودہ سال کی عمر ہی سے افسانے لکھ رہی تھیں لیکن باضابطہ 1993 سے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی زیادہ تر کہانیاں ''بانو'' دہلی اور ''زبان وادب'' پٹنہ میں شائع ہوئی ہیں اور کچھ کہانیاں پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی ہیں۔اعجاز شاہین نے ایم اے، بی ایڈ تک تعلیم حاصل کی اور اردو گرلز اسکول، پٹنہ میں بطور پرنسپل اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا جس کے اعتراف میں بہار اردو اکادمی نے ان کے دونوں افسانوی مجموعے 'تصور اور تصویر' اور ''یہ وادیاں'' کو انعامات سے نوازا۔ان کی وفات 1991 میں ہوئی۔

اعجاز شاہین نے خواتین کے مسائل پر بہت بے باکی سے لکھا ہے۔ انھوں نے نہ صرف مسائل کی نشاندہی کی ہے بلکہ ان کے حل بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔عورتوں پر ہونے والے مظالم، تشدد، استحصال اور روزمرہ کے مسائل کو انھوں نے بہت ہی خوبصورتی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں معاشرتی زندگی کی عکاسی بڑے ہی اچھے انداز سے کی گئی ہے۔ان کے دل میں عورتوں کا درد تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ بے بس، مظلوم اور استحصال شدہ عورتوں کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرتی رہیں۔ اپنے افسانوں کے موضوعات کے متعلق ''رہ گزر حیات'' میں لکھتی ہیں۔

''میرے اکثر افسانوں کا موضوع بے بس مظلوم عورت ہے۔ قریبی حلقوں میں لوگ مجھے عورت پرست کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ مجھے انکار نہیں۔ میرے دل میں عورت کا درد ہے۔ میں نے تڑپتی سسکتی عورت کو دیکھا ہے اور ان مردوں کو بھی جو عورتوں کا حق دبائے بیٹھے ہیں۔انھیں کبھی سماج کا خوف دلا کر ڈراتے ہیں اور کبھی مذہب کا سہارا لے کر ان پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں۔ بے چاری عورت سراپا ایثار و وفا ہے! اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس نے اپنا حق پالیا ہے حالانکہ جائز حق کے لیے ابھی اسے پورے سماج سے لڑنا ہے، متحد ہوکر آواز اٹھانا ہے۔''

اس اقتباس سے ہم بخوبی ان کے افسانوی نقطہ نظر سے واقف ہوجاتے ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اعجاز شاہین کا انداز منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت تلخ بھی ہے،انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ جب تک عورت اپنے مقام کا تعین خود طے کرنے میں پہل نہ کرے گی تب تک اس کے اندر نہ تو خود اعتمادی آئے گی اور نہ ہی معاشرے سے اس کا جائز حق ملے گا۔شبنم خاں اعجاز شاہین کی کہانیوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

''اعجاز شاہین کی کہانیوں کا موضوع وہ زندگی ہے جس کو وہ گزار چکی ہیں یا گزار رہی ہیں۔روزمرہ کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات وحادثات جو مرد کے لیے بھلے ہی اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن صنف نازک کے دل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں ایسے ہی واقعات اور حادثات کو بڑے ہی دلنشین انداز میں اعجاز شاہین اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔عورتوں کے مختلف موضوعات، ان کے بے بس جذبات اور حالات کی ستم ظریفی کو افسانے میں ڈھالنے کا فن اعجاز شاہین خوب جانتی ہیں۔''

(زبان وادب۔پٹنہ۔جلد 17 شمارہ 4 صفحہ 8)

اعجاز شاہین نے نہ صرف اپنے افسانوں کے ذریعہ عورتوں کے

مسائل کو منظر عام پر لانے کا کام کیا ہے بلکہ انھیں باوقار زندگی اور مستقبل کے لائحہ عمل پر بھی غور وفکر کرنے کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ صاف ستھرے انداز، سلیس زبان اور اچھوتے موضوع یہ تمام چیزیں ان کے افسانوں کی کامیابی کی ضمانت ہیں جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''انھوں نے انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ بغور کیا ہے۔ چنانچہ نفس انسانی کی بعض تہیں ان کی بعض کہانیوں میں کھلتی نظر آتی ہیں۔ یہ مطالعہ گھریلو زندگی کے معاملات اوران سے پیدا ہونے والے احساسات سے متعلق ہے اور یہی اعجاز شاہین کے فنی عمل کا خاص دائرہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات فنکار کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے کہ اس نے انہیں موضوعات پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے جن کے متعلق اس کی کافی معلومات اور تجربات ہیں۔ بہر حال ان تجربات اور معلومات میں حالات کی ستم ظریفی اور خاص کرداروں کے احساس محرومی کا پہلو غالب ہے یعنی درد وداغ کی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔''

(ڈاکٹر عبدالمغنی۔ پیش لفظ۔ تصور اور تصویر صفحہ 2)

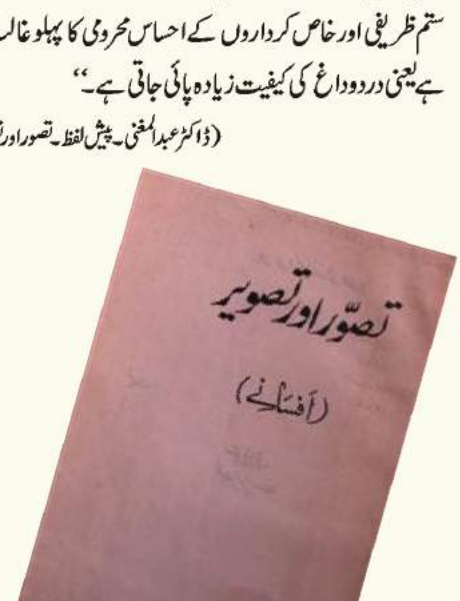

اعجاز شاہین کا افسانوی مجموعہ 'تصور اور تصویر' زیور پبلیکیشنز پٹنہ سے 1975 میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں کل گیارہ افسانے شامل ہیں۔ ممتاز آپا، درد لا دوا، اعتراف، ضمیر کی آواز، بٹوارہ، آئینہ، تصور اور تصویر، پیاس، رقیب نمبر دو، دو بوند آنسو اور زخم ہیں۔

اعجاز شاہین کا افسانہ ''ممتاز آپا'' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو ایک ڈپٹی کلکٹر کی بیٹی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دو بھائی اور بہنیں ہوتی ہیں۔ وہ دوران تعلیم بہت ہی ہنس مکھ اور بات بات پر ہنسنے والی ہوتی ہے۔ اس کی شادی اکرام سے طے ہوجاتی ہے وہ اس شادی کو لے کر بہت خوش رہتی ہے کہ اچانک اس کی زندگی میں ایک ایسا المناک حادثہ پیش آتا ہے کہ اس کی دنیا بدل جاتی ہے۔ ممتاز کے والدین شادی کے سلسلے میں خریداری کے لیے بازار جاتے ہیں اور ان کی گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرا جاتی ہے، جس کے نتیجے میں کچھ ہی دنوں میں والدین کا انتقال ہوجاتا ہے۔ ان کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے۔ ممتاز شادی کے بعد اپنے ساتھ اپنے بھائی اور بہنوں کو بھی رکھنا چاہتی ہے لیکن اکرام اس کے لیے راضی نہیں ہوتا اس لیے شادی نہیں ہو پاتی ہے۔

ممتاز آپا کے اوپر ذمہ داریوں کا پہاڑ ہوتا ہے۔ وہ اسی کالج میں نوکری کر لیتی ہیں جہاں سے انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کے مزاج میں بہت تبدیلی آچکی تھی وہ بہت گم سم سی رہتی تھیں۔ اچانک اسی کالج کے ایک استاد ڈاکٹر انصاری اس کی زندگی میں آجاتے ہیں اور ایک دوسرے کے بہت قریب ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری کے بیمار ہونے پر وہ ان کے گھر چلی جاتی ہے۔ یہ باتیں اس کی بہن کو ناگوار گزرتی ہے اور وہ اپنے باقی بہن بھائیوں کو ممتاز آپا سے دور رکھنے لگتی ہیں اور ایک دن جب ان کا چھوٹا بھائی ممتاز کے پاس جاتا ہے تو اسے روک کر طعنہ دے کر کہتی ہے ''پگلی..... کہاں جاتی ہے اب آپی ہماری نہیں رہیں۔ وہ تو ڈاکٹر انصاری کی ہوگئیں۔'' جس نے اپنا سب کچھ ان کے لیے قربان کر دیا ہو جب وہ یہ سنتی ہیں تو کانپ جاتی ہے اور اچانک ایک فیصلہ لیتی ہے اور ڈاکٹر انصاری سے کہتی ہے:

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کیوں نہ آپ میری فیملی میں شامل ہوجائیں۔''

''تم نے کیا کہا'' ڈاکٹر انصاری نے گڑبڑا کر کیا۔

''میں یہ کہہ رہی تھی ... آپ فیروزی سے شادی کر لیں، اس طرح آپ دونوں کو میری محبت برابر ملے گی۔ نہ کسی کو کم نہ کسی کو زیادہ'' ممتاز آپا کی بھیگی پلکیں جو کل رات سے نہیں سوکھی تھیں یکا یک خشک ہوگئیں۔ ''کیوں انصاری تمھیں انکار تو نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ تمھیں بھی بہن کی محبت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی غزل، ارشاد اور شیر و کو۔''

ممتاز...ڈاکٹر انصاری کی آواز حلق ہی میں گھٹ گئی۔ انھوں نے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ مگر ممتاز آپا نے کچھ اور ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ جب وہ اپنا آنچل سنوارتی اُٹھ گئیں، تو ڈاکٹر انصاری نے عجیب

تشویشناک نظر سے دیکھا۔ اگر اس وقت ان کے ہاتھوں میں چوڑیاں ہوتیں تو چھنک کر ضرور ان کی نیک نیتی کا اقرار کر لیتیں۔ مگر وہ توٹوٹ کر کب کی گر چکی تھیں۔ ممتاز آپا اناڑی جو تھیں۔''

(تصور اور تصویر، زیور پبلیکیشنز پٹنہ، 1975 صفحہ 25)

اس افسانے میں ایک عورت کے جذبۂ ایثار اور قربانی کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ اعجاز شاہین کا ہی خاصہ ہے۔ اس مجموعہ کا پیش لفظ پروفیسر عبدالمغنی نے لکھا ہے۔ وہ اعجاز شاہین کی افسانہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''بہر حال ایک کامیاب افسانے کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اس میں قصے کی دلچسپی پائی جائے اور اس کو پڑھ کر زندگی کا ایک جلوہ واقعہ نظر آئے۔ اعجاز شاہین کے افسانے اس بنیادی صفت کے حامل ہیں، ان میں قصے کا ماجرا (پلاٹ) منظم اور مرتب طور پر بنا ہوا ملتا ہے، کہانی کا ارتقا فطری رفتار سے ہوتا ہے، عروج ایک منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے، کردار واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ زبان و بیان صاف اور ہموار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں کو شروع کر کے ختم کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اور پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے انسانی زندگی کی ایک جھلک دیکھی، افراد کے باہمی تعلقات کا ایک جلوہ نہیں نظر آیا اور ان کے احساسات وجذبات کی کچھ باریکیاں اور ان کی گہرائیاں روشن ہوئیں۔''

(تصور اور تصویر، زیور پبلیکیشنز پٹنہ، 1975 صفحہ 5)

ان کے افسانے عورتوں کے مسائل اور نفسیات سے متعلق ہیں۔ اس لئے انہیں عورت پرست کہا جاتا ہے۔ 'آئینہ' اعجاز شاہین کا ایک نمائندہ افسانہ ہے جس میں مرکزی کردار زینت کاظمی ہے۔ زینت کاظمی جو اپنے والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ایک سلیقہ مند لڑکی تھی مائکے واپس جانے کے لئے اس لیے مجبور ہوگئی کیونکہ ڈرائنگ روم کے آئینہ کی کرچیاں فرش پر بکھری پڑی تھیں جنھیں وہ اس لیے نہیں سمیٹ سکی کیونکہ اس کے ہاتھ زخمی تھے اور اس کے ہاتھوں سے گرم لہو ٹپک رہا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''خوبصورت شیشے کے لئے ماتم کرنے والے دل میں خون کی کوئی قیمت نہ تھی۔ ہاں اپنوں میں ماسٹر کی حیثیت سے گھر کے ایک فرد ہونے کا حق شمیم میاں نے ادا کرنا چاہا، آگے بڑھے، زینت کا ہاتھ پکڑا اور بولے۔ کھولئے مٹھی، ان شیشوں کو پھینکئے پھر تقریباً گھسیٹتے ہوئے بیسن کے پاس لائے، ہاتھ دھویا، پٹی باندھی اور اماں کے پاس اجازت لینے آئے تاکہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھادیں۔ اماں کا موڈ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ وہ بے فکری سے بولیں ''چلو چلو جی، یہ نئی بات میں نہیں ہونے دوں گی۔ ذرا کھر ونچ کے لئے اتنی رات گئے اسپتال جانے کی ضرورت نہیں۔ اسد میاں آئیں گے تو چاہے اپنی مرضی سے نچایا کریں، میری جوتی کو غرض نہیں..''

اعجاز شاہین نے عورت کے مسائل پر زیادہ زور دیا ہے۔ وہ عورت کے درد کو اس طرح نہیں دیکھتیں جس طرح دوسری خواتین افسانہ نگار دیکھتی ہیں۔ دراصل وہ عورت کو یہ بتانا چاہتی ہیں کہ تمھاری شخصیت وہ نہیں ہے کہ صرف سسرال والوں کے ظلم سہتی رہو۔ تم اپنے حق کے لئے لڑو۔ چونکہ اس کے لئے عورتوں کو ہی سامنے آنا پڑے گا۔ ہر عورت جب ساس بنتی ہے تو یہ بھول جاتی ہے کہ وہ بھی کبھی بہو تھی اور اس پر بھی ظلم ہوئے تھے۔ شاید وہ اپنا بدلہ لینے کے لئے ہی اپنی بہو پر ظلم کرتی ہے۔ یہاں زینت کو اس بات کا بھی غم ہے کہ اس کا شوہر اسد اس کی قدر نہیں کرتا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''اسد کا رویہ شادی کی پہلی رات میں اتنا سرد رہا کہ زینت کے سارے خواب کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے۔ جب شوہر نے قدر نہ کی تو شوہر کے گھر والوں سے شکایت ہی فضول تھی۔ اسے ایک بے ضرورت ہستی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے ہر کام میں کیڑے نکالے جانے لگے۔ ایسے تنقیدی ماحول نے سلیقہ مند سمجھدار زینت سے ایک ڈری سہمی زینت کو جنم دیا۔ چھوٹے سے چھوٹا تا نکا اٹھانے والی محتاط انگلی موٹی موٹی چیزوں کا بار نہ سنبھال سکی۔ ہاتھ کانپا اور وہ چیز گری۔ وہ حیران تھی کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے۔''

(تصور اور تصویر، زیور پبلیکیشنز پٹنہ، 1975 صفحہ 66)

''آئینہ'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں اختصار بھی ہے اور وحدت تاثر بھی۔ اعجاز شاہین کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ صرف پلاٹ کی توجہ کرتی ہیں بلکہ ان کے افسانوں میں زمان و مکان کی پابندیاں بھی ملتی ہیں۔ اعجاز شاہین زمین سے جڑی افسانہ نگار ہیں۔ وہ جتنا توجہ موضوع پر دیتی ہیں اتنا ہی افسانے کے ہیئت پر بھی۔ کم سے کم لفظوں میں افسانے کو بیان کر دینا ان کی فنکارانہ صلاحیت کا ثبوت ہے اور جہاں بھی ان کو موقع ملتا ہے وہ طنز کے تیر چلانے سے نہیں چوکتیں۔ اس افسانے میں روانی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان بہت عام فہم ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی اعجاز شاہین کے طرز بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اعجاز شاہین کے طرز بیان میں جو سلاست ہے اس کو کچھ اور

سجل اور سبک ہونا ہے۔ اُردو زبان کے محاورات واستعارات اب بہت بالیدہ ہو چکے ہیں، لہٰذا ان سے خاطر خواہ طور پر کام لینے کے لئے ان پر پوری گرفت ضروری ہے۔ سیدھا سا دھا انداز بیان بھی اپنی جگہ بہت خوب ہے، بشرطیکہ وہ نک سک سے درست اور چست ہو۔ مجموعی طور پر اعجاز شاہین کے افسانوں کو پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ محترمہ شکیلہ اختر کے بعد بہار کی دوسری خاتون افسانہ نگار بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ صلاحیت مستقبل قریب میں ایک واقعہ بن سکے گی۔'' (تصور اور تصویر، زیور پبلیکیشنز پٹنہ، 1975 صفحہ 7)

اعجاز شاہین کے افسانوں میں کوئی الجھاؤ نہیں ہوتا۔ وہ مناسب موقعے پر اشارے سے بھی اپنا کام چلا لیتی ہیں۔ زندگی کے معمولی اور چھوٹے چھوٹے واقعات پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ ایسے موضوعات جو ہمارے سماج میں بکھرے پڑے ہیں اسے اعجاز شاہین نے بہت خوبصورت انداز میں اپنے افسانے میں پیش کیا ہے۔ ان کا ایک افسانہ ''کچی کلی'' ہے جس میں ماضی کی یادیں ہیں اس افسانے کا کردار انجلی کو اس کی یادیں ہر وقت کچوکے لگاتی رہتی ہیں۔ اعجاز شاہین لکھتی ہیں:

''انجلی نے شرت کو ٹٹولنے کے لئے ایک روز کہا تھا اب تم کو جانا چاہئے۔

''ہاں اور اتنا کہہ کر وہ ایک دم تیار ہو گیا۔ وہ تو اس انتظار میں تھی کہ شرت بہت کچھ کہے گا مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ بستر باندھے، کپڑے بدلے اور ٹیکسی لانے چلا گیا۔'' شرت کتنا عجیب تھا۔ انجلی نے سوچا جس خاموشی سے آیا ویسے ہی چلا گیا۔ جاتے وقت یہ بھی نہ کہا مجھے یاد رکھنا''

اعجاز شاہین کا ایک افسانہ ''دردلا دوا'' ہے۔ جس کے آغاز میں حیات کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ درمیانی حصہ ایک بے زبان عورت اور بے وفا مرد کی داستان دہراتا ہے۔ آخر میں راحت ڈاکٹر کے سامنے حیات سے متعلق اپنے اندیشے کا اظہار کرتی ہے۔ یہ کہانی اختصار کے ساتھ ذہن پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

اعجاز شاہین کا افسانہ ''بٹوارہ'' موجودہ مادہ پرست سماج کے منھ پر ایک طمانچہ ہے۔ اس افسانہ میں ایک امیر خاندان کی ایسی کہانی پیش کی گئی ہے جس سے اس طبقہ کی مال و دولت سے محبت اور ماں باپ کو ایک بوجھ سمجھنے کی ذہنیت سامنے آتی ہے۔ باپ کے جیتے جی سارے بھائی جائیداد کو آپس میں تقسیم کر رہے ہوتے ہیں کہ اچانک ان کی بہن بھی بھائیوں سے ملنے پہنچ جاتی ہے جو بیرون ملک سے بغیر اطلاع کیے آئے تھے۔ یہ لوگ اسے دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں اور آخر اس پر اس راز کا انکشاف کرتے ہیں کہ وہ ایک یتیم اور لاچار بچی تھی اور اسے گود لیا گیا تھا اس لیے تقسیم کے وقت اسے نہیں بلایا گیا وہ یہ جان کر اور خوش ہوتی ہے۔ بیٹے جائیداد کی تقسیم کر کے والدین کو بے یار و مددگار چھوڑ کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ لڑکی والدین کو آئندہ اپنے ساتھ رکھنے کے لیے راضی کر لیتی ہے اور ان کو اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اس افسانے میں بھی ایک عورت کی دریا دلی اور سوجھ بوجھ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اعجاز شاہین کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے افسانے کو کہیں سے بھی شروع کر دیتی ہیں۔ ابتداء، وسط اور انتہا کا لحاظ کیے بغیر لیکن کہانی پڑھنے کے بعد قطعی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ مصنفہ نے اپنا افسانہ یہیں سے کیوں شروع کیا۔ اعجاز شاہین کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''ان کی بیشتر کہانیاں پڑھنے کے بعد قاری خود کو آسودہ پاتا ہے۔ کبھی کبھی سیلاب گزر جانے کے بعد کا سناٹا بھی محسوس کرتا ہے۔ اور قاری خود فراموشی کے عالم میں فنکار کے ساتھ دور تک سوچتا چلا جاتا ہے۔''

(ڈاکٹر محمد حسین آزاد، نقد آزاد، صفحہ 42)

اس اقتباس سے ہم بخوبی ان کے افسانوی نقطۂ نظر سے واقف ہو جاتے ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اعجاز شاہین کا انداز منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت تلخ بھی ہے، انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ جب تک عورت اپنے مقام کے تعین خود پہل نہیں کرے گی تب تک اس کے اندر نہ تو خود اعتمادی آئے گی اور نہ ہی معاشرے سے اس کا جائز حق ملے گا۔ اعجاز شاہین نے نہ صرف اپنے افسانوں کے ذریعہ عورتوں کے مسائل کو منظر عام پر لانے کا کام کیا ہے بلکہ انھیں باوقار زندگی اور مستقبل کے لائحۂ عمل پر بھی غور و فکر کرنے کے لیے مجبور بھی کرتی ہیں صاف ستھرے انداز سلیس زبان اور اچھوتے موضوع یہ تمام چیزیں ان کے افسانوں کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

□□□

Dr. Aziz Ahmad Khan
House No. 9, Shadab Colony
2nd Floor, Mahanagar,
Lucknow-226006 (U.P)
Mob No. 8684943650

شاذ تمکنت
شخصیت اور فن

صبیحہ شمیم

کسی شخصیت کا تعارف آسان کام نہیں۔ ہر شخص بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے شباب اور شباب سے پیران سالی کی حدوں تک ایک کے بعد ایک ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔ یہ ساری منزلیں جب آپس میں مدغم ہوجاتی ہیں تب ہی ایک شخصیت تیار ہوتی ہے۔ اردو شعر و ادب میں شاذ تمکنت کی شخصیت ایک مثالی اور انوکھی شخصیت رہی ہے۔ وہ اپنے گرد کشش کا ایک ہالہ بنائے رکھتے ہیں اور یہ کشش کسی بھی باذوق فرد کو اپنا گرویدہ بنائے رکھنے کے لیے کافی ہے۔ شاذ کا ذوقِ جمال نہایت تربیت یافتہ تھا۔ شاعری میں وہ حسن معنی کے ساتھ آرائش الفاظ کے دلدادہ تھے۔ اسی طرح رعنائیٔ بدن کے ساتھ زیبائش لباس کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ شاذ کے رہن سہن اور لباس کی انفرادیت کی طرف مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے شاذ پہ لکھے خاکے میں کچھ یوں ان کی تصویر کشی کی ہے:

"وہ نہایت خوش لباس تھا اپنی چال ڈھال، وضع قطع ایسی رکھتا تھا کہ یہ تعارف کرانے کی حاجت ہی پیش نہ آتی تھی کہ وہ شاعر ہے۔"

(شاذ تمکنت، مجتبیٰ حسین، مجلّہ عثمانیہ، یادگار شاذ تمکنت، دسمبر 2007، ص155)

شعری تجربہ شاعر کی داخلی سطح پر شخصیت کی تمام تر قوتوں سے آب و رنگ کشید کر کے اپنی مخصوص، مربوط اور منفرد لسانی ہیئت میں ڈھلتا ہے اور اپنا تشخص منواتا ہے۔ یہ تجربہ کی شدت، پیچیدگی اور رنگارنگی کا ایک فطری، ترکیبی اور وحدت پذیرانہ مرکب ہے جو تخلیقیت کے آتشیں سیال سے برآمد ہوتا ہے اور اپنے مخصوص، نادر اور مربوط وجود کا احساس دلاتا ہے۔

جدید اردو شاعری میں شاذ تمکنت نے وجود کے رگ و ریشے میں داخل ہو کر تحریک اور نمو کو قالب میں ڈھالا ہے۔ شعر گوئی کی میکانکی عمل کی پابندی کرتے ہوئے اصلیت، پیچیدگی اور وسعت کے مطابق رنگارنگی پیدا کی ہے جس میں تجربے کا اکتشاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کے جدید دور میں انھوں نے خود کو نمایاں رکھا۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے جو الفاظ اور اصطلاحات سے مناسبت رکھتے ہیں۔

شاذ تمکنت 31/جنوری 1933 بروز منگل حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام سید مصلح الدین تھا۔ ان کے والد سید حفیظ ڈرامہ نویس تھے اور آباد تخلص کرتے تھے۔ شاذ کی والدہ کا نام جیلانی بیگم تھا۔ 1959 میں ان کی شادی حافظ محی الدین کی صاحب زادی محمدی بیگم سے ہوئی۔ جن سے انھیں چھ لڑکے سید واصف الدین نژاد، سید فواد الدین فواد، سید حسن محی الدین ایراد، سید توصیف الدین شہزاد، سید فریس الدین بہزاد اور سید لطاف الدین فرہاد ہوئے۔

1962 میں شاذ ایم اے درجہ اول میں کامیاب ہوئے اور ان کا عارضی تقرر ورنگل آرٹس کالج میں بحیثیت لکچرر رہا۔ 1967 میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرار انوار العلوم کالج حیدرآباد میں ہوا۔ اکتوبر 1977 میں شاذ کا تقرر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر ہوا۔ 1982 کے بعد شاذ کی صحت مسلسل گرتی چلی گئی۔ علالت کا سلسلہ جاری رہا کثرت مے نوشی

سے انھیں جگر کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔اور 18 اگست 1985 اتوار کی صبح ساڑھے چار بجے شاذ تمکنت کی وفات ہوگئی۔تدفین قبرستان احاطہ درگاہ یوسفین میں ہوئی۔

شخصیتیں اضافی اور تہہ دار ہوا کرتی ہیں اور اعمال و افکار سے عبارت ہوتی ہیں۔شاذ تمکنت کی شخصیت کے بہت سے دلکش اور متاثر کن پہلو ہیں جنہیں ان کے احباب، انکے بیٹے، ان کے بھائی اور ہمعصر اور ان کے پیش رووں نے اپنے مضامین میں ضبط تحریر کیا ہے۔شاذ کے بیٹے نژاد تمکنت کے لکھے مضمون ''بابا کی یاد میں'' کے اقتباسات:

''وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں بلکہ معمولی سی جان پہچان والوں کی خدمت کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتے تھے۔کسی بے روزگار شخص کی نوکری کا مسئلہ ہو یا خاندان میں کسی کا میل میلاپ کروانا ہو غرض یہ کہ کام کی نوعیت کچھ بھی ہو ہمیشہ کام کو خلوص سے کردیتے تھے۔'' (صفحہ 211)

''بابا کو خوشبو کا بڑا شوق تھا جب کوئی باہر سے آتا ان سے Perfume کی فرمائش کرتے۔ان کے پسندیدہ Perfume میں Brut, Intimate Oil Spin وغیرہ شامل تھے۔'' (صفحہ 213)

شاذ تمکنت سرتاپا شاعر، عاشق اور رند تھے۔اچھی صورت سے، اچھی آواز سے، اچھے لباس سے، اچھے رنگ سے، خوشبو سے غرض کہ حسن کی ہر جھلک سے اور ہر جلوے سے وہ بڑا شدید عشق کرتے تھے۔وہ تمام عمر حسن اور شائستگی کے گرویدہ رہے اور عشق کی آگ میں جلتے رہے۔ان کی شخصیت کا نمایاں ترین زاویہ ان کی رومانیت ہی تھی۔ادھورے نشے کی سی ایک کیفیت، ایک کھویا کھویا سا انداز، ایک شاعرانہ مزاج، اور ایک طرح کی خود فراموشی کا سایہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔

شعر و ادب سے شاذ کو بے پناہ دلچسپی تھی۔انھیں اپنے فن سے گہرا لگاؤ اور مکمل وابستگی تھی۔ان کا حافظہ بھی غضب کا تھا تمام معروف اور غیر معروف شعراء کے بہترین اشعار انہیں ازبر تھے۔ولی سے لے کر فراق تک سارے شعراء کے دواوین وہ کھنگالتے رہتے تھے۔ان کا ذوقِ شعری نہایت شستہ اور نفیس تھا۔بقول پروفیسر مغنی تبسم:

''ان کی نظموں میں لہجے کی انفرادیت اور تازگی کے ساتھ ایسی پختہ کاری تھی، باور نہیں آتا تھا کہ یہ وہ نومشق شاعر کا کلام ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاذ ایک نابغہ روزگار تھے۔اگر وہ شاعری کے علاوہ نثر نگاری پر خصوصی توجہ دیتے تو وہ ایک قد آور نقاد، ایک کامیاب محقق اور عظیم انشاء پرداز کی حیثیت سے بھی نمایاں مقام پاتے لیکن جو مقام انھیں اردو شاعری میں ملا جن مختلف کیفیات کو انھوں نے اپنی شاعری میں سمویا، اپنے فن سے محسوسات کی جونئی دنیا آباد کی، شہرت اور مقبولیت کے جس عروج پر پہنچے وہ انھیں بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں ایک منفرد اور ممتاز شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

شاذ کے کل پانچ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ان کا پہلا مجموعہ کلام ''تراشیدہ'' 1966 میں شائع ہوا اس کے بعد ''بیاضِ شام'' 1973، ''نیم خواب'' 1977، ''ورقِ انتخاب'' 1981 میں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ سے شائع ہوا اور آخری مجموعہ کلام ''دستِ فرہاد'' 1994 (بعد از مرگ) میں شائع ہوا۔

شاذ نے اپنی شاعری کی ابتداء نظم نگاری سے کی۔اس میں کوئی شک نہیں ان کی نظمیں وسیع کینوس کی حامل ہیں لیکن ان کی شاعری کا جادو ان کی غزل گوئی میں بھی بے حد نمایاں ہے۔غزل کا جادو جگانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔اس کے لیے کافی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔انھوں نے غزل کے فنی اور فکری تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے ہر رنگ و آہنگ کی غزلیں کہی ہیں۔انکے موضوعات میں تنوع اور ایجاز و اختصار کی سحر کاری ہے۔غزل کے آداب سے اپنی واقفیت کا اعتراف شاذ نے خود بھی کیا ہے۔

اے ارض و سما تجھ میں دل بن کے دھڑکتے ہیں
کچھ یوں ہی نہیں ہم کو آدابِ غزل آ گئے

شاذ غزل کے روپ میں اپنے محبوب کو کن کن دلنواز پیکروں میں دیکھنا چاہتے ہیں اس کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں تو محال و دشوار ضرور ہے۔مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہمارے عشق کی بنیاد ہے فراق پہ شاذ
خدا کرے کہ یہ نکتہ چھپا رہے تم سے

اپنی اپنی شبِ تنہائی کی تنظیم کریں
چاندنی بانٹ لیں مہتاب کو تقسیم کریں

غزل پر یہ الزام کہ اس میں ذہنی کیفیت کا انتشار پایا جاتا ہے۔صحیح نہیں ہے۔غزل کی شاعری میں خاص طور پر منطقی تسلسل کی نسبت ہمہ گیر نفسیاتی کیفیت کی موجودگی اور جذباتی تسلسل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔شاذ کی غزلوں میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔شاذ کی شاعری ہجر و وصال

کی کشاکش کا خوبصورت تخلیقی اظہار ہے۔ وہ وصل کے نہیں ہجر کے شاعر ہیں:

ہم شاذ سے سیکھیں گے زخموں کی چمن بندی
کچھ دل کو لہو کرنا، کچھ پھول کھلا دینا

رفتہ رفتہ اس کی باتیں دل میں گھر کرتی گئیں
آخر آخر اس کے قصے دکھ سوا دینے لگے

عذاب بھی ہے راحت وصال کے ساتھ
ملی تو کہیں مجھے خوشیاں مگر ملال کے ساتھ

شاذ تمکنت کو غزل اور نظم دونوں اصناف پر یکساں قدرت حاصل تھی وہ دونوں اصناف کے فنی نظام اور لوازمات سے واقف تھے۔ انہوں نے دونوں صنف میں طبع آزمائی کی اگر غزل کو نیا لہجہ دیا تو نظم کو بھی نئے جہاں کی سیر کرائی۔ شاذ کی ابتدائی دور کی نظموں کی نمایاں خصوصیت مرصع اور مرقع نگاری ہے۔ انھوں نے اپنی بیشتر نظموں میں خارج سے داخل اور داخل سے خارج کی سیاحت کا قصہ ایک سلیقے سے رقم کیا ہے۔

شاذ تمکنت کے لہجے کا گداز اور تخیل کا مزاج ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ شاذ پیکر تراشی کے فن سے واقف تھے۔ جذبے کی پیش کش کے لیے وہ نئی تشبیہوں اور نئے الفاظ کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کی نظمیں خارجی

محبت'' کے چار مصرے ملاحظہ فرمائیں:

زمانہ ہو گیا ہے خال و خط کو اپنی یاد آئے
نہیں ممکن کہ اب آئینہ میرا عکس لوٹائے
سراپا جرم ہوں آسودہ لطف و کرم ہو کر
میں شاید رہ گیا پہلی محبت کی قسم ہو کر

ان کی نظم ''خرابہ'' میں جذبے کی شدت کے ساتھ نئی امیجری بھی ہے۔ یہ امیجری نئی نظم کے مزاج سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے ایک بند ملاحظہ ہو:

چاندنی کی نیم خوابیدہ اداسی کا فسوں
بام و در کے مضمحل شانوں پہ تھک کر سوگیا
اُڑتے اُڑتے یک بہ یک چاہت کا البیلا چکور
اندھے کہساروں کی ڈھلوانوں پہ تھک کر سوگیا
تو شگفتہ نیم اس ارماں کا پیک گلبدن
مدتیں گذریں کہ ویرانوں پہ تھک کر سوگیا!

شاذ زندگی کے شاعر ہیں۔ تصورات اور نظریات کے نہیں، انھوں نے کبھی بھی کسی نظریہ کو اپنے اوپر لادا نہیں بلکہ جس نے ان کے ذہن سے مطابقت کی اسے قبول کر لیا۔ ان کی نظموں میں جن تجربات کی پیش کش ہوتی ہے ان پر ان کی اپنی انفرادیت کی مہر ثبت ہوتی ہے۔ ان کی نظم ''زندگی'' کے چند اقتباس دیکھیے:

کہاں ہے زندگی
کیا روپ تھا
کیا ناک نقشہ تھا
بھلا کیسے بتاؤں گا
کہ میں اس کا سراپا جانتا کب ہوں؟

شاذ چونکہ رومانی پرور دل کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں محبت کی جتنی کیفیتوں کا اظہار کیا ہے۔ شاید ہی کسی اور شاعر نے کیا ہو۔ انھوں نے اکثر مختصر نظمیں لکھی ہیں، جس میں ان کے مزاج کی رومانیت اور خیال پرستی کے عکس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ''رتجگا'' ان کی ایک مختصر لیکن اچھوتی نظم ہے۔ شاعر سے بارِ وفا سہا نہیں جا رہا ہے۔ وہ نظم کے آخر میں کہتا ہے:

اب آؤ آکے امانت سنبھال لو اپنی
تمام عمر کا یہ رتجگا تمام ہوا
میں تھک گیا ہوں مجھے نیند آئی جاتی ہے!

شاذ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے فہم و ادراک کی گلکاریوں اور غنائیت کے روشن پہلو نے ان کے تخلیقی سفر کو اعتبار بخشا ہے۔ ایک کامیاب غزل گو کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے نمائندہ نظم گو کی حیثیت سے انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے علاوہ شاذ نے اپنے فن کا کمال قطعات، گیت، نعت، اور مناجات میں بھی بدرجہ اتم دکھایا ہے۔ خود ان کی زبان میں:

''میرا ایقان ہے کہ سچا ادیب و شاعر وہی ہے جو اپنے جذبات کی زیریں آنچ سے تپ کر تخلیق کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو''۔

(لطف خلش پیکاں، شاذ تمکنت، نگارشات شاذ تمکنت، شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، اشاعت 2008 صفحہ 196)

Dr. Sabiha Shamim
Patna Engineering
National Market Below
SBI Bank, Jain Mandir
Tatarpur, Bhagalpur-812002(Bihar)

محمد یونس انصاری

قرۃ العین حیدر اور انیتا دیسائی کے ناولوں میں تفاوت و مماثلت

قرۃ العین حیدر اور انیتا دیسائی اردو انگریزی کی معتبر ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ میدان فن دونوں کا ایک ہی ہے مگر زبان و ادب کا امتیاز انھیں دو مختلف خانوں میں بانٹ دیتا ہے۔ قرۃ العین حیدر اردو ادب کا ایک بڑا نام ہے اور انیتا دیسائی انگریزی زبان و ادب میں بہ حیثیت ناول نگار مشہور ہیں۔ صنف ناول پر دونوں نے بیش قیمتی تخلیقات سے ذخیرۂ ادب کو ثروت مند بنایا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''کار جہاں دراز ہے''، ''گردش رنگ چمن'' اور ''چاندنی بیگم'' جیسے اہم ناول لکھ کر اردو میں تہلکہ مچا دیا تو انیتا دیسائی نے ''کرائی دی پیکوک''، ''وائسیز اِن دی سٹی''، ''بائے بائے بلیک برڈ''، ''دی پیکوک گارڈن''، ''ویئر شیل وی گو دِس سمر''، ''فائر آن دی ماؤنٹین''، ''کلیئر لائٹ آف ڈے''، ''اِن کسٹڈی'' اور ''فاسٹنگ فیسٹنگ'' جیسے ناولوں کے ذریعہ انگریزی ادب میں اپنا لوہا منوا لیا۔

قرۃ العین حیدر کا شمار اردو کے صف اول کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے جن کی تصانیف نے جہان اردو کو مالا مال کر دیا۔ انیتا دیسائی کو ہندوستانی انگریزی ادب میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دونوں نے جس صنف پر فنی جوہر کا مظاہر کیا وہ ایک ہی ہے جو قصہ گوئی کے لیے متعین ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ایک سے بڑھ کر ایک ناول لکھے۔ ''آگ کا دریا'' ان کا سب سے عمدہ شاہکار اور فنی کمال کا نتیجہ ہے جس نے انھیں اردو ادب میں حیات جاوداں عطا کی۔ دوسری طرف انیتا دیسائی نے جس روانی اور تسلسل کے ساتھ لکھا ہے، وہ قابل فخر بھی ہے اور ذہانت و دانش مندی کا ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ دو مختلف زبانوں کی خاتون ادیباؤں کی ناول نگاری کا جائزہ لینے سے قبل سوانحی نقطۂ نظر سے بھی سرسری نظر ڈال لینا اس لیے بہتر ہے کہ مصنف کسی نہ کسی کتاب میں یا کسی نہ کسی پہلو سے اپنے سوانحی کوائف کا ذکر ضرور کرتا ہے جس سے قرۃ العین حیدر اور انیتا دیسائی بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ دونوں کے یہاں سوانحی عناصر پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ''کار جہاں دراز ہے'' اور انیتا دیسائی کا ''کلیئر لائٹ آف ڈے'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

انیتا دیسائی 28 جون 1937 کو مسوری میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ماں ٹانی نیمے ایک جرمن خاتون تھیں اور والد ڈی این مزومدار بنگال کے تاجر تھے۔ انیتا دیسائی کے والد ان کی ماں سے اس وقت ملے جب وہ برلن میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ بعد ازاں ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا اور بالآخر دونوں میاں بیوی کے رشتہ سے منسلک ہو گئے۔ ان کی شادی اس زمانے میں طے پائی جب کسی ہندوستانی کا یورپین عورت سے شادی کرنا بہت بڑی بات

ہوا کرتی تھی۔

انیتا دیسائی گھر میں جرمن زبان بولتی تھیں اور باہر اردو، انگلش اور بنگالی۔ اسکول میں انھوں نے سب سے پہلے انگریزی سیکھی بعد میں دوسری زبانیں یہی وجہ ہے کہ انگریزی ان کی ادبی سرگرمیوں کا جزوخاص بن گئی جس میں وہ اکثر لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتی تھیں۔ پڑھنا لکھنا ان کے بچپن کا شوق تھا عام طور سے وہ گھر پر کہانیاں پڑھتی رہتی تھیں۔ آٹھ سال کی کمسن عمر میں انھوں نے پہلی کہانی لکھی اور جب وہ نو سال کی ہوئیں تو ان کی پہلی کہانی شائع ہوئی۔ انیتا دیسائی نے دہلی کے ''کوئین میری ہائر سکنڈری اسکول'' سے انٹرمیڈیٹ کیا اور 1957 میں انگریزی ادب میں دہلی یونیورسٹی کے مرنڈا ہاؤس سے بی اے کے ڈگری حاصل کی۔ انیتا دیسائی نے محسوس کیا کہ بہتر زندگی کے سفر میں شریک حیات کا ہونا بھی ناگزیر ہے۔ ابھی تک وہ دوسروں کی کہانیاں پڑھ رہی تھیں اور مطالعہ ومشاہدہ کی بنیاد پر کہانیاں تخلیق کر رہی تھیں مگر شادی کے بعد کا تجربہ کرنا باقی تھا۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر کمپنی کے ڈائریکٹر اور بٹوین ایٹرنٹیز: آئیڈیاز آن لائف اینڈ دی کوسموس'' Between Eternities:Ideas on Life and The Cosmos کے مصنف اشونی انیتا دیسائی کی زندگی میں آئے اور پھر ان کے ہوکر رہ گئے۔ انیتا دیسائی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی کرن دیسائی ہے۔ کرن دیسائی بھی انگریزی ناول نگار ہیں جنھوں نے ماں کے نقش قدم پر چلنا پسند کیا اور ''دی ان ہیریٹینس آف لاس'' The Inheritance of Loss نام سے ناول لکھا۔ اس پر انھیں بکر ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

اسے انیتا دیسائی کی تخلیقی صلاحیت ہی کہیں گے کہ ملک وبیرون ملک ان کی فن کاری کا نہ صرف ڈنکا بجا بلکہ ان کے ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس عالمگیر شہرت ومقبولیت نے انھیں انگریزی ناول نگاری میں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ انھوں نے جب سے انگریزی ناول نگاری میں قدم رکھا ہے تب سے وہ تواتر کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔ ''کرائی دی پیکاک'' Cry The Peacock ان کا پہلا ناول ہے جو 1963 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ''کلیر لائٹ آف ڈے'' Clear Light of Day 1980 میں منظر عام پر آیا اور پھر ''ان کسٹڈی'' In Custody بکر پرائز کے لیے نامزد ہوا۔ 1999 میں ایک اور ناول ''فاسٹنگ فیسٹنگ'' Fasting, Feasting بکر پرائز کے لیے منتخب کیا گیا جس سے انیتا دیسائی کی مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔ یکے بعد دیگرے وہ انعام پر انعام حاصل کرتی چلی گئیں اور دنیائے ادب میں ان کا قد بڑھتا چلا گیا جسے دیکھتے ہوئے میساچوسیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، امریکہ نے انھیں بہ حیثیت تخلیقی مصنف مقرر کیا۔

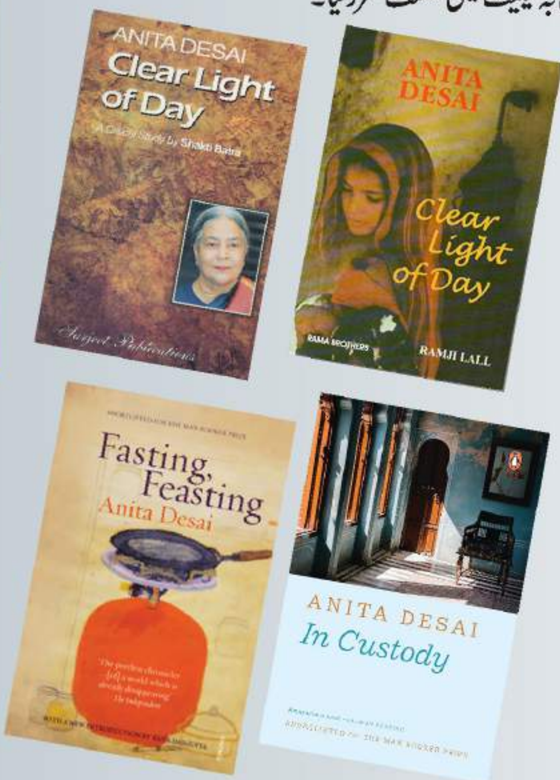

چونکہ انیتا دیسائی کی ماں جرمن تھیں اور باپ ہندوستانی۔ اس نسلی امتیاز نے انھیں انسانی وجود کو سمجھنے کی قوت دی۔ دو مختلف تہذیب وثقافت اور جغرافیائی حالات سے تعلق رکھنے والے ماں باپ کے ماحول کا ہی اثر تھا کہ نو سال کی عمر میں انھوں نے ''وودرنگ ہائٹس'' پڑھا اور ڈی ایچ لارنس، ورجینیا وولف، ہنری جیمس، ایملی ڈکنسن سے متاثر ہوئیں۔ ایک انٹرویو میں وہ کہتی ہیں:

> ترجمہ: ''مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی مرتبہ 'کیمس' پڑھا تو اس نے مجھے زبردست طریقے سے متاثر کیا۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے اس کتاب کو بار بار پڑھا تھا۔ میرے خیال میں ایسی ہی چیزیں ہوتی ہیں جو پڑھنے کی طرف مائل کرتی ہیں۔ دوستوفسکی الگ قسم کا مصنف تھا جسے پڑھنے میں میں نے کم عمری میں ہی دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اس کے کرداروں کی الگ ہی دنیا داری تھی۔''

(Demas, Corinne. "Against the Current: A conversation with Anita Desai." Anita Desai: Critical Perspectives, Ed. Devindra Kohli and Melanie Maria Just. New Delhi: Pencraft International, 2008, p. 28)

انیتا دیسائی مغربی ادیبوں سے بے حد متاثر رہی ہیں۔انھوں نے مغربی مصنفین کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے جس کا اثر کچھ حد تک ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔اس بات کا اعتراف انھوں نے مذکورہ اقتباس میں بھی کیا ہے۔ان کے ناولوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے یہاں شاعرانہ موزونیت،سحر انگیزی اور تخلیقی صلاحیت ملتی ہے۔ان کے ناول وجودیت کے نظریہ حیات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔بطور فن کار انیتا دیسائی قائق کی جستجو میں سرگرداں نظر آتی ہیں اور انفرادی وجودیت کے المیہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں دلچسپی لینے لگتی ہیں۔معاشرہ سے دور ہوتے فرد اور اس کی کھوکھلی دنیا پروہ زور دیتی ہیں۔ان کے ناولوں میں سماجی شعور، مرد وزن کے رشتے، تنہائی، بے گانگی اور تلخ معاشرتی مسائل جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔

''وائسیز ان دی سٹی''میں انیتا دیسائی نے شہری زندگی میں الجھ کر دربدر ہونے والے مخصوص لوگوں کا دردفنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ناول کی تعریف بیان کرتے ہوئے لائنل ٹرلنگ کہتے ہیں:

ترجمہ:''ناول حقیقت کی ایک دائمی جستجو ہے،اس کی تحقیق کا میدان ہمیشہ سماجی دنیا ہے،اور اس کے تجزیے کا مواد انسان کی روح کی جانب اشارے کے لحاظ سے مروجہ طور طریقے ہیں۔''

(Trilling, Lionel. 1961). The Liberal Imagination: Essay in Literature and Society.London: Mercury Books p. 212)

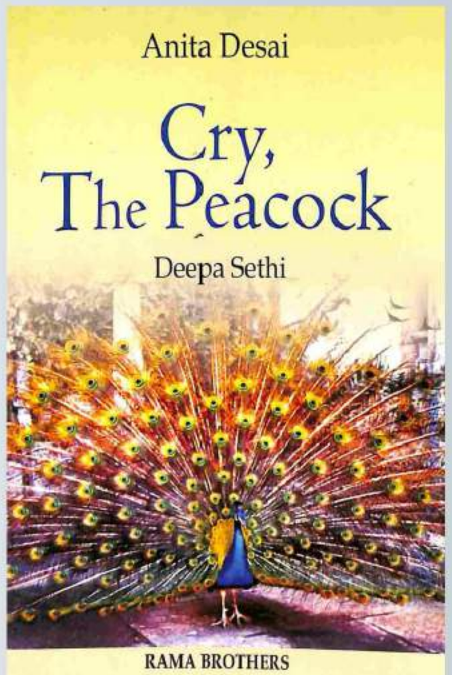

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول داخلی وخارجی حقیقت کی تلاش وجستجو کی کوشش کرتا ہے۔ناول میں کلکتہ میں ٹوٹتے بکھرتے بنگالی گھرانے کی زبوں حالی کی سچی تصویر اتارتا ہے۔مگر علامتی سطح پر ناول کرداروں کے وجودی المیہ کو سامنے لاتا ہے جو کلکتہ جیسے بڑے شہر کی فضا میں زندگی کی تلخیوں سے گزرتے ہیں۔یہاں دیسائی انسانی تجربات کے منفی اور مایوسانہ احساسات سے لبریز داخلی ماحول کا عکس اتارتی نظر آتی ہیں۔ناول کو کلکتہ شہر کے تین کرداروں کی دردناک صورت حال بیان کرنے والی داستان کہا جاسکتا ہے۔

انیتا دیسائی نے اپنے ناولوں میں گھریلو نااتفاقیاں اور روزمرہ کے جھگڑوں کو سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کیا ہے جو ہندوستان کے روایتی گھرانوں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ہندوستان میں مرد حاکم ہوتا ہے اور سارے فیصلے اسی کے ذریعہ لیے جاتے ہیں۔وہ گھر کا مکھیا ہوتا ہے اور گھر کے بڑے کاموں کو انجام دیتا ہے عورت اس کی محکوم اور طابع رہتی ہے۔دیسائی اپنے ناولوں میں عورت کو مظلوم کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں جس کا استحصال ہوتا رہا ہے۔''کرائی دی پیکوک''ان کا پہلا ناول ہے جس میں مرد وزن کے باہمی رشتوں اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنے والے رویوں کو اجاگر کرتا ہے۔''فائر آن دی ماؤنٹین''میں بھی مرد وعورت کے تعلقات کو نمایاں کیا گیا ہے۔''کلیر لائٹ آف ڈے''میں بملا سارے دکھوں کو جھیلتے ہوئے ذمہ داری کا فرض نبھاتی ہے۔''فاسٹنگ فیسٹنگ''میں اُما خاموشی کے ساتھ ظلم وستم کو سہتی رہتی ہے۔اس طرح ان کے ناولوں میں سماجی، نفسیاتی، تہذیبی، نسلی اور گھریلو مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔اس سلسلے میں یہ عبارت قابل غور ہے:

''ناول کی ہیروئن مایا معصوم اور بے حد حساس قسم کی شادی شدہ عورت ہے جو شوا اور اس کے گھر والوں کی نفرت کو برداشت کرنے کی قوت رکھتی ہے۔زندگی اور موت کے لیے کی جانے والی کوشش وجدوجہد کا ڈرامہ معاصر خواتین کی محبت کی چاہت کی ترجمانی کرتا ہے جہاں مرد اسے بے وقوف بنا کر خودکشی کرنے پر مجبور کرنے کا ذمہ دار ہے۔''

(Society And Individual In The Novels of Anita Desai, Suneet Aupadhyay, 2011chapter 3,p. 3)

قرۃ العین حیدر 20 جنوری 1926 کو لکھنؤ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجاد دونوں صاحب قلم تھے۔گھر میں ادب کا ماحول تھا۔پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں

ورثے میں ملا۔انھوں نے اپنی ذہانت کا ثبوت بطور عظیم فکشن نگار پیش کیا ہے۔ زندگی کے ابتدائی ایام پورٹ بلیئر میں گزرے اور ابتدائی تعلیم دہرہ دون میں حاصل کی۔ 1947 میں انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔لکھنؤ کے علاوہ لندن کے ایک آرٹ اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی۔قرۃ العین حیدر انگریزی بہت اچھا لکھتی تھیں اس لیے ان کی ابتدائی کہانیوں پر انگریزی کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

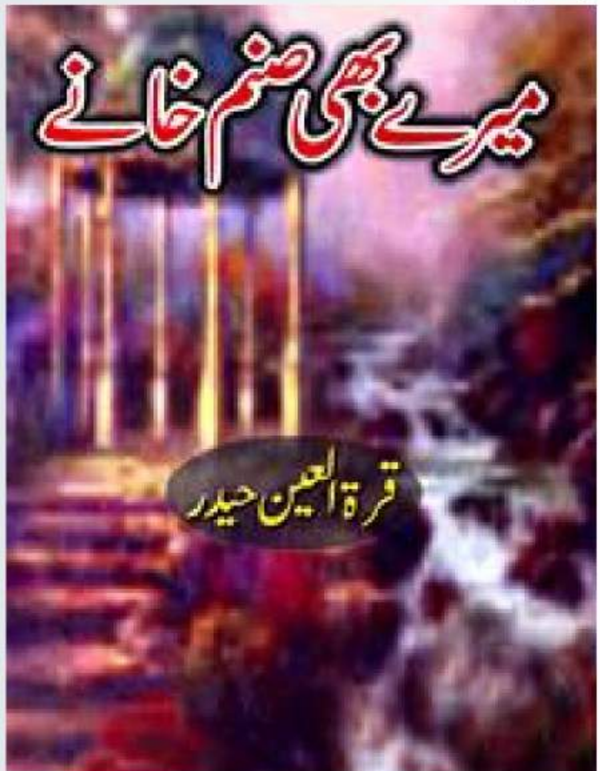

1947 میں قرۃ العین حیدر نے پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' کے نام سے تحریر کیا۔1954 میں 'سفینہ غم دل'،1959 میں 'آگ کا دریا'، 'آخر شب کے ہم سفر'(1979)، 'کار جہاں دراز ہے'(پہلا حصہ 1979 اور دوسرا حصہ 1990 میں شائع ہوا)، 'گردش رنگ چمن'(1988) اور 'چاندنی بیگم'(1989) وغیرہ شائع ہوئے۔انھوں نے ناولوں کے علاوہ بڑی تعداد میں افسانے بھی لکھے۔ پہلا افسانوی مجموعہ 'ستاروں سے آگے' ٹھیک اسی سال منظر عام پر آیا جس سال 'میرے بھی صنم خانے' شائع ہوا تھا۔ یوں انھوں نے ناول کے ساتھ افسانے بھی لکھنا شروع کر دیے تھے۔'شیشے کے گھر' 1956 میں شائع ہوا۔'پت جھڑ کی آواز' 1967 میں منظر عام پر آیا۔اس کے بعد دو افسانوی مجموعے 'روشنی کی رفتار' 1982 میں اور 'جگنوؤں کی دنیا' 1990 میں شائع ہوئے۔انھوں نے چند ناولٹ بھی لکھے جن کے نام بالترتیب اس طرح ہیں: 'سیتاہرن'، 'چائے کے باغ'، 'دلربا'، 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'، 'فصل گل آئی یا اجل آئی' اور 'ہاؤسنگ سوسائٹی' وغیرہ۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ملک کی مٹتی ہوئی تہذیب وثقافت، آزادی کا حصول اور تقسیم ہند کا المیہ دردناک انداز میں سمٹ کر ''آگ کا دریا'' میں آگئے ہیں جو ملک کی وسیع تاریخ تک پھیلا ہوا ہے۔ان کے یہاں فلسفہ بھی ہے اور اعلیٰ تعلیم بھی۔انھوں نے زیادہ تر اعلیٰ طبقہ کی ترجمانی پر خاص توجہ دی ہے اور اودھ کی تہذیب کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔ علاوہ ازیں نفسیاتی ،سیاسی ،سماجی اور تہذیبی نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے انسانی زندگی کے مسائل کو بھی سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں مرد وزن کا اختلاط اظہار محبت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے سے آئندہ کی زندگی کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔چونکہ انھوں نے تعلیم یافتہ معاشرہ کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے اس لیے ان کے یہاں عورت اور مرد کی ملاقاتیں علمی سطح تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں:

> ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں مرد اور عورت ایک سماجی مسئلے کی حیثیت سے کم ابھرتے ہیں یہ ضرور ہے کہ وہ آخر میں کسی نہ کسی سماجی پہلو سے متاثر ہو جاتے ہیں لیکن ناول کے شروع میں ان کی علم دوستی ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔قرۃ العین حیدر کے ہیرو اور ہیروئن آپس میں اظہار محبت کے لیے نہیں ملتے بلکہ ان کا مقصد اپنی آئندہ زندگی کا پراسپکٹس تلاش کرنا ہوتا ہے۔''

(شعور کی رو اور قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر ہارون ایوب، اردو پبلشر، لکھنؤ، 1978، ص:62-63)

اردو میں جب قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کا ذکر ہوتا ہے تو شعور کی رو کی بات چل پڑتی ہے۔دراصل اردو ناول میں یہ تکنیک ''لندن کی ایک رات'' میں استعمال کی جاچکی تھی مگر چوں کہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کو وسیع پیمانے پر شہرت وبلندی نصیب ہوئی اس لیے اس تکنیک کا ذکر ان کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی کیا جاتا رہا ہے۔شعور کی رو کی تکنیک کو قرۃ العین حیدر نے اس طرح برتا کہ اس سے کرداروں کے داخلی اور خارجی زندگی کے علاوہ حال اور ماضی بھی کھل کر ظاہر ہوگئے ہیں۔

انگریزی میں شعور کی رو کو بلند سطح پر پہنچانے میں جیمس جوئس اور ورجینیا وولف کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔شعور کی رو کے تحت بیان کی جانے والی کہانیوں کے سلسلے میں انھوں نے بتایا کہ کہانی اس طرح چلتی ہے جیسے

کسی شخص کے ذہن میں تاثرات کی بے ہنگم دھار جاری ہو مگر ربط وسلسلہ نام کو بھی نہ ہو۔ اردو میں جب شعور کی رو پہلی بار داخل ہوئی تو قارئین کو کچھ نیاپن محسوس ہوا اس سے قبل کے ناولوں میں پلاٹ اور کرداروں پر توجہ دی جاتی تھی جبکہ شعور کی رو کے ناولوں میں کرداروں کی ذہنی کیفیت بیاں کی جاتی ہے۔ جب قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینہ غم دل'' اور ''آگ کا دریا'' شائع ہو کر منظر عام پر آئے تو ادبی حلقوں میں ہما ہمی کا عالم بپا ہو گیا خاص طور سے ''آگ کا دریا'' کو لے قارئین پر جوش نظر آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ناول پوری شان وشوکت اور تمام نئی خصوصیات کے ساتھ اردو ادب میں داخل ہوا۔ یہ خصوصیات انگریزی ناول میں بہت پہلے سے موجود تھیں۔

ان کی زبان میں چاشنی زبان کی روانی اور سلاست کے سبب قائم رہتی ہے۔ علاوہ ازیں جملوں کے بے ربط ہونے کے ساتھ ان میں ایک خاص ربط بھی برقرار رہتا ہے۔ جس سے نثر میں رنگینی پیدا ہو جاتی اسی کو نثر میں شاعری کہہ سکتے ہیں۔ انھیں وقت کی قدر ہے تبھی تو وقت فلسفیانہ سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ماضی کو بھی بار بار یاد کرتی ہیں مگر انھیں رومانیت کا سہارا دے دیتی ہیں یہی ان کا منفرد انداز ہے۔

کردار نگاری میں بھی قرۃ العین حیدر کا جواب نہیں۔ ان کے سارے کردار سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور شعور واحساس میں فرق بھی نہیں دِکھتا کہ وہ کسی طرح الگ ہوں۔ ان کے کردار پرسکون اور فکر سے بے نیاز ہوتے ہیں کیوں کہ وہ معاشی طور پر خوشحال اور اہل ثروت ہیں۔ فنون لطیفہ سے انھیں بے حد لگاؤ ہے۔ وہ پڑھے لکھے، دانش مند اور سنجیدگی کا پیکر نظر آتے ہیں جن میں لڑکوں کے مقابلے لڑکیاں زیادہ ہیں۔ ان کے مذکورہ کردار ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی دباؤ کا بھی شکار رہتے ہیں۔

اردو ناول نگاری میں قرۃ العین حیدر نے نئی تکنیک برت کر ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا انداز واسلوب انوکھا ہے۔ انھیں زبان پر مکمل گرفت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے خیال کو ایک جملے میں ادا کر دیتی ہیں۔ انداز تحریر میں جملوں کی بہترین ساخت نغمگی پیدا کرنے کا کام کرتی ہے۔ ''آگ کا دریا'' میں ان کا زبان واسلوب منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے انھوں نے فطرت کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، اس پر ایک طرح کا سحر طاری ہو جاتا ہے اور زبان کی کشش اسے لمبے وقت تک اپنے گرداب میں پھنسائے رکھتی ہے۔ فطرت کی عکاسی وہ یوں کرتی ہیں:

''برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اشوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔۔۔۔۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ شراوستی یہاں سے پورے پچیس کوس تھا۔''

(آگ کا دریا، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2021، ص:15)

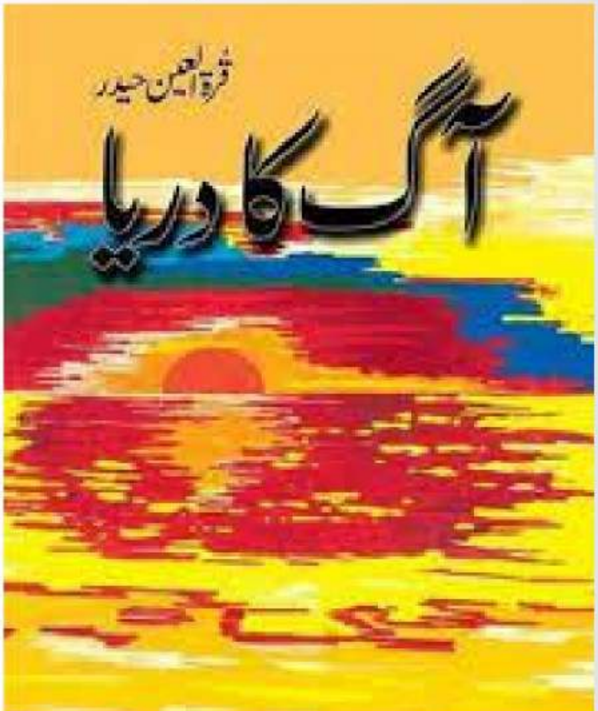

قرۃ العین حیدر انیتا دیسائی سے عمر میں بڑی ہیں مگر اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ 21/ اگست 2007 کو وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ انیتا دیسائی حیات ہیں اور امید وامکان ہے کہ وہ کوئی نئی تخلیق پھر سے لا سکتی ہیں۔ ناولٹ کو چھوڑ کر ذخیرۂ ادب کے لحاظ سے قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی کل کائنات ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینہ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''کار جہاں دراز ہے''، ''گردش رنگ چمن'' اور ''چاندنی بیگم'' تک محدود ہے جبکہ انیتا دیسائی کے ایک درجن سے زائد ناول شائع ہو چکے ہیں جن میں سے کچھ اہم ناول مندرجہ ذیل ہیں: ''کرائی دی پیکوک'' Cry, The Peacock(1963)؛ ''ووئسیز اِن دی سٹی'' Voices in the City(1965)؛ ''بائے بائے بلیک برڈ'' Bye-bye Blackbird(1971)؛ ''دی پیکوک گارڈن'' The Peacock

Garden(1974)، ''ویئر شیل وی گو دِس سمر'' Where Shall We Go This Summer?(1975)، ''کیٹ آن اے ہاؤس بوٹ'' Cat on a Houseboat(1976)، ''فائر آن دی ماؤنٹین'' Fire on the Mountain(1977)، ''گیمز ایٹ ٹویلائٹ'' Games at Twilight(1978)، ''کلیئر لائٹ آف ڈے'' Clear Light of Day(1980)، ''دی ولیج بائی دی سی'' The Village by the Sea(1982)، ''اِن کسٹڈی'' In Custody(1984)، اور ''فاسٹنگ فیسٹنگ'' Fasting, Feasting(1999)

قرۃ العین حیدر کو تاریخ سے زیادہ دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں پرانی تہذیب بار بار اجاگر ہوئی ہے۔ ''آگ کا دریا'' ان کی اسی دلچسپی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے تبھی تو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کا جائزہ کئی ہزار سال پیچھے مڑ کر لیا ہے۔ ان کے ناولوں میں سیاسی ہنگامہ آرائیاں، تقسیم ہند اور فسادات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے پست طبقے کے بجائے اعلیٰ طبقہ کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے ناولوں میں تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر خوشحال کردار نظر آتے ہیں۔

انیتا دیسائی نے مختلف النوع موضوعات پر ناول لکھے ہیں۔ ان کے یہاں تہذیب و تمدن کا عکس بھی ہے اور معاشرہ کے پست طبقے کے مسائل بھی۔ قرۃ العین حیدر کے برعکس انھوں نے پسماندہ لوگوں کی عکاسی کی ہے اور تقسیم سے قبل اور بعد کے حالات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ انیتا دیسائی نے مرد وزن کے باہمی تعلقات اور میاں بیوی کے خانگی مسائل کو موضوع بحث بنایا اور اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ہندوستان میں عورت کا سب سے زیادہ استحصال ہوا ہے۔ مرد نے اسے اپنا غلام سمجھا اور اس کے حقوق اور خواہشوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ محض اپنی گھریلو حکمرانی میں مگن رہا حالانکہ قرۃ العین حیدر کے یہاں مرد وزن کے رشتے تعلیمی مباحث اور زندگی کو بہتر بنانے کے لیے قائم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں اظہار محبت سے زیادہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کو ترجیح دی گئی ہے۔ انیتا دیسائی کو غربت و تنگدستی پسند نہیں وہ اس کے تدارک کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ ''دی ولیج بائی دی سی'' میں ہندوستانی باشندوں کی زندگی اور ان کے رہن سہن کے انداز کی حقیقی تصویر کھینچتے ہوئے وہ معاشرہ کے اس ناسور کو سب کے سامنے لا کر پیش کرتی ہیں۔ ناول میں نچلے اور پست طبقے کے حالات و کیفیات سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو غربت و افلاس کا درد سہتے سہتے تنگ آ چکا ہے۔ گاؤں میں ہری کے گھر کی منظر کشی غربت کی جس سطح پر آ پہنچی ہے، وہ قابل رحم صورت حال ہے۔ ناول کا اقتباس دیکھئے:

ترجمہ: جھونپڑی اس قدر پرانی تھی کہ کھجور سوکھ کر گر رہے بانس سے پھسل کر گر رہے تھے۔ سالوں پہلے جھونپڑی کی مرمت ہوئی تھی۔ مٹی کی دیواریں گرنے لگی تھیں، روشن دان میں کھڑکیا تک نہ تھیں، ہانڈی میں کچھ نہ تھا کہ اس کے پکنے سے دھواں باہر نکلتا ہوا دکھتا جیسے دوسری جھونپڑیوں میں دھواں اٹھ رہا تھا۔۔۔''

(The Village by The Sea, Anita Desai, p.)

قرض کی ادائیگی کے لیے زمین بیچ دی گئی بس ذرا سا ٹکڑا تھا جس پر سبزی اگائی جاتی۔ جانور بیچ دیے گئے۔ باپ شرابی تھا، ماں بستر مرگ پر پڑی تھی۔ بچوں کو نہ ٹھیک سے کھانا ملتا تھا اور نہ کپڑے۔ گاؤں دیہاتوں کی زندگی کی یہ سچی تصویر ہے۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے ہری اور لِلا کی پڑھائی رک گئی تھی۔ بیلا اور کمال کے اگلے سال کے لیے کتابیں خریدنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ سوکھی روٹی سوکھے چاول کھانے پر مجبور تھے۔ آمدنی کا واحد ذریعہ ناریل کی فصل تھی جو کبھی کبھی ہوا کرتی تھی۔ ''دی ولیج بائی دی سی'' مارکسی نظریات پر مبنی ناول ہے جو ہندوستانی معاشرہ میں زندہ رہنے کی طبقاتی جدوجہد کے منظر نامے کو بیان کرتا ہے۔ اس میں انتہائی دلبرداشتہ حالات سے متاثر گھرانے کی تصویر کشی کی گئی۔

انیتا دیسائی نے غریب اور پست طبقے کے مسائل کی نشاندھی کی ہے جبکہ قرۃ العین حیدر کے زیادہ تر ناولوں میں طبقۂ اعلیٰ کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ تقسیم ہند کے حالات کی عکاسی بھی دونوں ناول نگاروں کے یہاں ملتی ہے مگر قرۃ العین حیدر نے اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے اور انیتا دیسائی نے ''کلیئر لائٹ آف ڈے'' میں اسے پس منظر کے طور پر جزوی حیثیت دی ہے۔ زبان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو دونوں کے یہاں دلنشیں اور رنگین نثر شاعرانہ موزونیت کے ساتھ ملتی ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے بھی قرۃ العین حیدر اور انیتا دیسائی کے ناولوں میں مماثلت ہے۔ فلیش بیک اور شعور کی رو کی تکنیک دونوں کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی پہلو ہیں جن میں مشابہت تلاش کی جاسکتی ہے۔

□□□

Mohd Yoonus Ansari

H . N. 184, Mohalla Tandola

Tanda Badli,

Distt. Rampur-244925 (U.P)

Mob: 8791364110

حدیثہ افضل

ہندوستان کی روشن خیال خواتین

ہم سب واقف ہیں کہ برطانوی اقتدار کے ابتدائی دور یعنی انیسویں صدی میں مغربی تعلیم، تہذیب اور مغربی افکار نے ہندوستان کے روشن و آزاد خیال طبقے کے لوگوں کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ جدید علوم حاصل کرنے کے سبب جب ہندوستانیوں کے ذہن میں انقلاب برپا ہوا اور ان کے سوچنے سمجھنے کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا تو کچھ دانش مند افراد نے سماجی سطح پر مذہب کے حوالے سے اصلاح معاشرہ کی ضرورت کو محسوس کیا اور صدیوں سے چلے آ رہے خواتین کے مسائل اور سماج میں ان کی ابتر حالت پر خاص توجہ دی۔

یوں دیکھا جائے تو ہندوستان میں اصلاح کا بیڑہ اٹھانے والے تمام مصلحین مرد تھے جنھوں نے حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن غیر ملکی خواتین جیسے اینی بسنٹ اور مارگریٹ وغیرہ کی آمد سے ہندوستان کی سماجی و اصلاحی تحریکات کو ایک خاص تقویت ملی۔ بلکہ یوں کہیے کہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ معاشرہ میں تعلیم نسواں کی اہمیت و افادیت بڑھتی گئی اور اعلیٰ طبقے کی چند آزاد خیال خواتین نے اصلاحی کاموں میں حصہ لے کر پورے ہندوستانی سماج کو دعوت فکر و عمل کا پیغام دیا اور اپنی جرأت مندی کا ثبوت فراہم کیا۔ ان ہندوستانی خواتین میں سروجنی نائیڈو، سورن کماری دیوی، مہارانی تپیشوینی، رانی شرنومئی، پنڈتا رامائی، ساوتری بائی پھولے، رقیہ سخاوت حسین اور رانا بائی رانا ڈے وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں جنھوں نے تحریک تعلیم نسواں کو ایک نئی سمت عطا کی نیز اپنی عملی کاوشوں سے لڑکیوں کے لیے اسکولز، بیواؤں کے لیے آشرم اور معاشرہ میں تعلیمی بیداری لانے کے لیے جلسوں اور تقاریر کا بھی اہتمام کیا۔

1879 میں مسز اینی بسنٹ کی قیادت میں ''تھیوسوفیکل سوسائٹی'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس سوسائٹی کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی گئی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ مسز اینی بسنٹ نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیتے ہوئے اپنی جدوجہد سے ہندوستان میں تعلیم نسواں کو بڑھاوا دیا اور اسی غرض سے 1904 میں بنارس میں ہندو لڑکیوں کے لیے ایک مرکزی مدرسہ بھی قائم کیا جو ہندستانی خواتین کی تعلیم کے حوالے سے ان کا ایک زندہ جاوید کارنامہ ثابت ہوا۔

سروجنی نائیڈو

بھارت کوکیلا (Nightengale of India) کے نام سے یاد کی جانے والی سروجنی نائیڈو نے بھی حقوق نسواں کے حوالے سے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے۔ بقول ڈاکٹر بانو سرتاج:

> ''سروجنی نائیڈو 1921 میں عورتوں کو ووٹ کا حق دلانے میں کامیاب ہوئیں۔ اس کے بعد انھوں نے روزلٹ ایکٹ کی مخالفت میں خواتین کو ساتھ لے کر مظاہرے کیے۔ اسی

سال لندن میں جلیانوالہ باغ کے واقعے کے دوران خواتین پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔"

(راحت سلطانہ: ادب اور خواتین صفحہ نمبر 182)

مہارانی تپسوینی

جو رشتہ میں رانی لکشمی بائی کی بھتیجی تھیں، انھیں بھی عورتوں کی تعلیم سے خاص شغف تھا۔ تعلیم نسواں سے متعلق ان کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بنگال میں ایک اسکول "مہا کالی سنسکرت پاٹھ شالہ" کے نام سے قائم کیا۔ ان کے بعد ایک اور اہم نام "پنڈتا رامابائی" کا ہے جنھوں نے عورتوں کے ساتھ ہونے والی سماجی ناانصافیوں، تعلیم کا فقدان اور فرسودہ رسومات کے خلاف اپنی آواز بلند کی اور معاشرے کے ذہنی شعور کو بیدار کرنے کی غرض سے کئی بار ملک کا دورہ بھی کیا۔ رامابائی نے بالخصوص کم سنی کی شادی کو روکنے کے لیے پونا میں "مہیلا آریہ سماج" کی بنیاد ڈالی جس کی شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں پھیلتی دکھائی دیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ممبئی میں 1889 میں "شارداسدن" قائم کیا جس نے بیواؤں کی تعلیم اور دیگر سہولیات کے متعلق بہت سی خدمات انجام دیں۔

سورن کماری دیوی

یہ رابندرناتھ ٹیگور کی بہن تھیں۔ انھوں نے 1884 میں ایک بنگالی رسالہ Bamabhadini Patrika کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اس رسالہ میں خاص طور سے خواتین کی اصلاح کے حوالے سے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ سورن دیوی نے 1886 میں "لیڈیز ایسوسی ایشن" Ladies Association نامی ایک تنظیم کا آغاز کیا۔ اس پلیٹ فارم سے انھوں نے عورتوں کے تعلیمی و ذہنی شعور کو بیدار کیا تاکہ سماج میں عورتیں تعلیم حاصل کر کے ملک میں تعلیم نسواں کی تحریک کو ایک نئی راہ دکھا سکیں۔

رانی شرنومئی

مرشدآباد کے راجہ کرشن ناتھ کمار رائے بہادر کی بیوہ تھیں۔ اگرچہ وہ خود تعلیم یافتہ نہیں تھیں لیکن شوہر کے انتقال کے بعد ریاست کی تمام تر ذمہ داریاں شرنومئی نے خود سے سنبھالیں۔ تعلیم کے میدان میں انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے ریاست میں مختلف اسکولز اور ہاسٹل تعمیر کرائے۔

"راج شاہی کے اینگلو ورنکولر اسکول کی عمارت بنوانے کے لیے انھوں نے 500 روپے کا عطیہ دیا۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے سہولیات فراہم کیا کرتی تھیں۔ انہیں کی کوشش سے 1886 میں کلکتہ کے میڈیکل کالج میں لڑکیوں کے لیے ایک ہوسٹل کی تعمیر ہوئی جس میں تقریباً 15 لڑکیاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔"

(سیمیں ثمر فضل: ابتدائی ناولوں کا حصہ، آبادی پبلی کیشنز: 1991 صفحہ 95)

ساوتری بائی پھولے

جیوتی بائی پھولے کی اہلیہ ساوتری بائی پھولے انیسویں صدی کی اہم ریفارمر اور تعلیم نسواں کی زبردست حامی و علمبردار تھیں۔ ان کی انتھک عملی کاوشوں سے ہندوستان میں تعلیم نسواں کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ساوتری بائی پھولے نے ہندوستان کی پہلی معلمہ اور خاتون مصلح کار کی حیثیت سے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ناخواندگی کے سبب سماج میں عورتیں ابتر حالت کا شکار ہیں۔ لہٰذا اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے تعلیم کے ذریعے عورتوں کو سماجی دلدل سے نکالنے اور پسماندگی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی نیز عملی طور پر اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں کا بیڑہ اٹھایا تاکہ وہ علم کی دولت سے مالامال ہوکر معاشرہ میں اپنا ایک اہم مقام بنا سکیں۔ البتہ انھیں سب باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ساوتری پھولے نے فاطمہ شیخ کے تعاون سے پونا کی سرزمین پر 1848 میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول قائم کیا جو ان کے کارناموں کی ایک عمدہ مثال ثابت ہوا۔

چنانچہ بنگال میں لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں جہاں راجہ رام موہن رائے اور ایشور چندر ودیا ساگر نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے وہیں چند روشن خیال مسلم خواتین "فیض النساء، چودھرانی کریم النسا خانم" وغیرہ نے بھی بنگال تعلیم نسواں کو مزید تقویت بخشی اور اپنی انتھک عملی کاوشوں سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔

"تاریخی نقطۂ نظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو بنگال میں تعلیم نسواں کی پیش رو دراصل نواب فیض النسا، چودھرانی کو کہنا کسی طرح مبالغہ نہ ہوگا۔ موصوفہ پچھم گاؤں ضلع کملا کی رہنے والی تھیں اور انھوں نے کملا شہر میں فیض النساء گرلز انگلش ہائی اسکول 1873 میں قائم کیا تھا ترقی دے کر اب یہ اسکول خواتین کے لیے ڈگری کالج بنا دیا گیا ہے۔"

(مضمون بنگال میں تعلیم نسواں کا آغاز، تہذیب الاخلاق، نومبر 1988، جلد 11، شمارہ 7 صفحہ 28)

ان کے بعد بنگال کی ایک اور مشہور و معروف خاتون رقیہ سخاوت حسین جو سید سخاوت حسین کی اہلیہ تھیں، انھوں نے بھی موجودہ زمانے میں

تعلیم نسواں کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے 16/ مارچ 1911 کو کلکتہ میں ''سخاوت میموریل اسکول'' قائم کیا جو آخر کار بیگم رقیہ کی محنت شاقہ سے ترقی کے تمام مراحل سے گزر کر سخاوت میموریل ہائر سکینڈری لیول تک پہنچ گیا اور اسے سرکاری حیثیت بھی حاصل ہوگئی۔ البتہ موصوفہ نے مسلم بچیوں کی تعلیم، خواتین کی سماجی اصلاح اور ان کے تحفظ کی بقاء کے لیے انجمن خواتین اسلام نامی تنظیم کی بنیاد ڈالی اور دیگر سماجی تنظیموں مثلاً '' آل بنگال ویمن ایجوکیشن'' اور '' آل انڈیا مسلم ویمن سوسائٹی'' کی روح رواں اور سرگرم رکن بھی رہیں۔

جسٹس رانا ڈے کی اہلیہ راما بائی رانا ڈے نے بھی تعلیم نسواں کے میدان میں کئی خدمات انجام دیں۔ 1884 میں انھوں نے ممبئی کے گورنر سر جیمس سے خطاب کرتے ہوئے پونا میں لڑکیوں کے اسکول قائم کرنے کی عرضداشت پیش کی اور لڑکیوں کی تعلیم کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''ہندو لیڈیز کلب'' کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ راما بائی نے وقتاً فوقتاً اپنی تقریروں کے ذریعے سماج میں تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کیا اور ان کے اندر تعلیمی و ذہنی شعور پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

ہندوستان میں بالخصوص ہندوؤں میں تعلیم نسواں کے فروغ کے سلسلے میں ''بھارت استری منڈل'' کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ 1910 میں مسز سین کی صدارت میں جلسہ لاہور کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں اس سبھا کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ عورتوں کی تعلیم کو بڑھاوا دینے اور سماجی سطح پر ان کی زندگیوں میں تبدیلی لانے میں ''بھارت استری منڈل'' نے اہم رول ادا کیا۔ اس کمیٹی کے محرک اراکین میں شریمتی سرلا دیوی، رانی صاحبہ پرتاپ گڑھ، مسز نارائن سنگھ، مسز موتی لال نہرو، مسز للت موہن بینر جی اور مسز جیوتی سروپ وغیرہ جیسی معزز خواتین شامل تھیں۔

مزید یہ کہ تحریک تعلیم نسواں کو ملک گیر پیمانے پر استحکام عطا کرنے میں جہاں مسلم طبقے کے روشن خیال مردوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے تعلیم نسواں سے عام بیزاری اور بے حسی کو دور کرنا چاہا وہیں چند مسلم تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین نے بھی اپنے قلم کا سہارا لیتے ہوئے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تاہم ان خواتین میں سلطان جہاں بیگم بھوپال، صغریٰ ہمایوں، نفیس دلہن اور عطیہ فیضی جیسی بے شمار خواتین کی کوششیں شامل ہیں جنھوں نے اپنی عملی کاوشوں سے خواتین میں تعلیمی بیداری، آزادی اور معاشرتی اصلاح کے تصور کو عام کیا۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کو بڑھاوا دینے میں جن تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں انھیں میں ایک اہم نام ''نواب سلطان جہاں بیگم'' کا ہے۔ انھیں خصوصاً مسلم خواتین کی تعلیم سے بے حد لگاؤ تھا۔ انھوں نے باقاعدہ اپنی تحریر و تقریروں سے ماحول کو سازگار بناتے ہوئے نہ صرف تحریک تعلیم نسواں کو فروغ بخشا بلکہ لڑکیوں کی تعلیم کی ترقی کے لیے تعلیمی اداروں میں مالی امداد بھی بہم پہنچائی اور ان تمام تحریکوں کی سرپرستی قبول کی جس سے ملکی سطح پر عورتوں کی تعلیم کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

''ریاست میں اخوان و اراکین ریاست کے بچوں کی تعلیم کے لیے الیگزنڈر ہائی اسکول کھولا۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے 1341ھ میں ''مدرسہ سلطانیہ'' اور ہندو لڑکیوں کے لیے ''برجسیہ کنیا پاٹ شالا'' قائم کیا۔

(رسالہ خاتون، جنوری 1914 جلد۔1 شمارہ۔1 ص۔7۔6)

حیدرآباد کی ایک دوسری خاتون ''صغریٰ ہمایوں'' اپنے دور کی ایک مشہور مصنفہ اور سماجی و تعلیمی تحریکات کی ایک سرگرم رکن تھیں اور ان کی سرپرستی میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایک اہم جریدہ ''زیب النساء'' شائع ہوا۔ صغریٰ ہمایوں نے مسلم خواتین کی معاشرتی و تعلیمی اصلاح کے لیے صدائے احتجاج بلند کی اور خصوصاً تعلیم نسواں کے موضوع پر اپنے عہد کے اخبار و رسائل میں کثرت سے مضامین اور کئی ناول لکھے جن میں سے ''سرگزشت ہاجرہ''، ''مشیر نسواں'' اور انوری بیگم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

البتہ ان مشہور و معروف خواتین کے علاوہ عورتوں کی تعلیمی ترقی میں عطیہ بیگم فیضی اور ان کی بہن زہرہ بیگم فیضی نے طبقۂ نسواں کی آزادی اور تعلیمی اصلاح کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ''نفیس دلہن'' بھی طبقۂ نسواں کی اصلاحی تحریک کی بڑی حامی و مبلغ تھیں۔ انھوں نے کئی بار بحیثیت سیکریٹری مسلم لیڈیز کانفرنس کے فرائض انجام دیئے تاہم نفیس دلہن نے تعلیم نسواں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے عورتوں کے جلسے سے خطاب کیا اور اپنی پرزور تقریروں سے طبقۂ نسواں میں بیداری کی ایک لہر پیدا کی۔ الغرض عورتوں کی معاشرتی اصلاح، تعلیمی ترقی اور سماجی حیثیت کو بلند کرنے میں ہندوستان کی ان مسلم خواتین کی عملی کاوشوں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

Hadisa Afzal
Ph.D Research Scholar
H.No. 3311 Farhatullah Street
Kucha Pandit, Lal Kuan
Delhi-110006

محمد عمر

ذکیہ مشہدی
بحیثیت افسانہ نگار

اصل نام ذکیہ سلطانہ، قلمی نام ذکیہ مشہدی، والد کا نام حکیم احمد صدیقی۔ ذکیہ مشہدی کی پیدائش 1944 میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ذکیہ مشہدی کا تعلق یوپی کے ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ اس کے بعد نفسیات میں ایم-اے اور پھر بی-ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ ایم۔اے کے بعد کونوٹ کالج لکھنؤ میں بحیثیت لکچرر پانچ سال خدمات انجام دیں اور پھر استعفیٰ دے دیا۔ لکچررشپ سے مستعفی ہونے کے بعد بی-ایڈ کالج پٹنہ میں مدرس کے طور پر کام کیا۔

ذکیہ مشہدی جدید دور کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ انھیں کہانیاں لکھنے کا شوق اوائل عمری سے ہی تھا تاہم باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز 1974 کے آس پاس رسالہ ''آواز'' اور رسالہ ''آج کل'' میں لکھی کہانیوں سے ہوا۔ اس سلسلے میں ذکیہ مشہدی اپنے پہلے افسانوی مجموعے ''پرائے چہرے'' کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

> ''گرچہ میری فطرت میں افسانہ نگاری کے جراثیم کم عمری سے ہی موجود تھے لیکن چونکہ شدید قسم کی لا ابالی پن بھی مزاج کا حصہ تھے۔ اس لیے میری افسانہ نگاری کی عمر جتنی ہونی چاہیے تھی، اس سے بہت کم ہے یعنی صرف سات آٹھ برس''

ذکیہ مشہدی کے کل چھ افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پرائے چہرے'' ہے۔ دیگر افسانوی مجموعے ''تاریک راہوں کے مسافر''، ''صدائے بازگشت''، ''نقش ناتمام''، ''یہ جہان رنگ و بو'' ہیں۔

کہانیوں میں ''موتیا کی خوشبو''، ''بانٹ یہ لمحے کوئی چرایا ہوا سکھ''، ''چاند کے ہاتھ''، ''چرایا ہوا سکھ''، ''بیوی کی نیاز''، ''ڈاکٹر دیوتا''، ''صدائے بازگشت''، ''ایک مکوڑے کی موت''، ''اور بھیڑیے سیکولر تھے'' وغیرہ ہیں۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہر لکھنے والے کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ یا واقعہ ضرور ہوتا ہے جس سے وہ متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ سب ادیبوں پر یہ اصول نافذ ہو یہ کوئی ضروری نہیں تاہم ذکیہ مشہدی خود اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ میری افسانہ نگاری کے پیچھے ایک حادثہ موجود ہے اور وہ حادثہ ہے میری شادی۔ ذکیہ مشہدی کا گھرانہ تو پڑھا لکھا تھا تاہم ادب سے اس قدر شغف نہ تھا کہ ذکیہ مشہدی شادی سے قبل ذکیہ مشہدی بن

پاتی۔مشہور افسانہ نگار، ڈراما نگار اور شاعر، شفیع مشہدی سے ذکیہ مشہدی کی شادی ہوئی اور ذکیہ مشہدی کو وہ ماحول مل گیا کہ جس نے انھیں افسانوی ادب میں اہم مقام دلایا۔

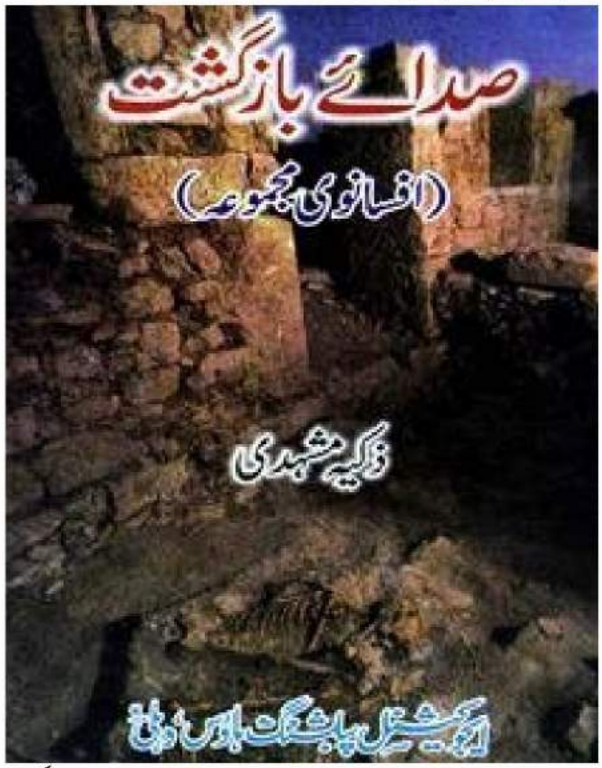

ذکیہ مشہدی کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو دانستہ طور پر کسی پلان کے مطابق نہیں لکھتی۔انھیں جب کوئی واقعہ، کوئی کردار یا کوئی حادثہ متاثر کرتا ہے تو وہ دوسروں کو بتانے کے لیے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، ایسے بھی جیا جاسکتا ہے، ایسے بھی کیا جاسکتا ہے، لکھتی ہیں۔ذکیہ مشہدی نے کامیاب افسانہ نگاری کے لیے تین چیزوں کو ضروری قرار دیا۔حساس دل، وسیع تجربہ اور الفاظ پر قدرت۔ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں عورتوں کے رنج والم اور حسرت ویاس کی سچی تصویر کشی ملتی ہے۔عورت کی نفسیات پر ان کی گہری نظر ہے۔وہ ایک حساس دل کی مالک ہیں۔ذکیہ مشہدی کا تجربہ بہت زیادہ ہے گوکہ انہوں نے بہت کم لکھا لیکن جتنا لکھا لکھنے کا بھرپور حق ادا کیا۔اردو، انگریزی اور ہندی، ان تینوں زبانوں پر ان کو عبور حاصل۔انھوں نے بھوانی بھٹہ چاریہ کی انگریزی کتاب کا اردو میں اور جیلانی بانو کے اردو افسانے کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ ہندی کتابوں کے تراجم بھی اردو زبان میں کیے۔ان کے قلم میں روانی، موضوعات میں تازگی اور کہانیوں میں حقیقت نگاری کی عمدہ تصویر کشی ملتی ہے۔

عام طور پر ذکیہ مشہدی کی کہانیوں کے موضوعات عورتوں کی نفسیات اور خانگی زندگی ہیں جس کی عمدہ مثالیں افسانہ ''ایک تھکی ہوئی عورت'' اور ''شکستہ پروں کی اڑان'' ہیں۔افسانہ ایک تھکی ہوئی عورت کے مرکزی کردار اجے اور وسندھرا ہے۔اجے شادی سے قبل اور شادی کے ایک سال بعد تک وسندھرا سے خوب محبت کرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اجے کا رویہ بدلتا گیا اسے وسندھرا سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔وہ وسندھرا کی نفسیات کو سمجھنے سے قاصر ہونے لگا۔وسندھرا اسی اجے کی تلاش میں ہوتی ہے جسے اس نے چاہا تھا اور وہ ہر رات اپنی سہاگ رات کی طرح گزارنا چاہتی ہے۔لیکن اجے اب ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتا اور وسندھرا تھک ہار کر اجے کی پشت سے لپٹ کر سو جاتی ہے۔اس افسانے میں ذکیہ مشہدی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت مرد سے جس چیز کی طلبگار ہوتی ہے وہ کوٹھی بنگلہ مکان نہیں چاہتی بلکہ عزت، پیار اور سکون کی متمنی ہوتی ہے۔

افسانۂ شکستہ پروں کے درمیان میں'' ناصرہ بیگم کی کہانی ہے۔ناصرہ بیگم کے شوہر اکثر بیمار رہتے تھے۔۔بیماری کے سبب ان کا انتقال ہوجاتا ہے۔ناصرہ ابھی عمر کے اس حصہ میں ہے کہ دوسری شادی کر سکے۔یاسمین ناصرہ کی لڑکی ہے۔جس کی پروش اس کے چچا کے ہاتھوں ہوئی۔وہ انھیں بہت عزیز تھی۔ناصرہ کو دوسری شادی کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ اسد کے خواب دیکھنے لگی۔دلہن چچی ناصرہ سے اکثر یہی کہتی کہ اللہ اللہ کرو۔کیوں کسی کے چکر میں پڑتے ہو۔نماز پڑھو اللہ کو یاد کرو اور بیٹی جوان ہے اس کی شادی کی فکر کرو۔دلہن چچی ناصرہ کی نفسیات کو سمجھ نہ سکی۔اسد عمر میں ناصرہ سے چھوٹا تھا۔ناصرہ اس کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن اسد ناصرہ کی بیٹی یاسمین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔جب یاسمین نے امی ناصرہ کو بتایا کہ اسد اسے پسند کرتا ہے اور شادی کا خواہاں ہے تو نادرہ بیگم یہ سن نہ پائی۔وہ اس جانماز کی تلاش میں لگ گئی جسے ایک عرصہ سے وہ بھول گئی تھی۔

ذکیہ مشہدی عورت کی نفسیات سے واقف ہیں۔انھوں نے ایک بیوہ عورت کی نفسیات کو کس طرح سمجھا اور کس انداز سے بیان کیا یہ دلچسپ مرحلہ ہے۔یہ حقیقت ہے کہ اگر کوئی عورت جوانی میں بیوہ ہوجائے تو اس کی نفسیات کو سمجھنے سے زمانہ عاری ہوتا ہے اگر وہ شادی کے لیے اصرار کرے تو اسے طعنہ زنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔گھر کے افراد بھی اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور وہ اپنے تمام ارمانوں کا گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو زندہ دفن کر دیتی ہے۔ذکیہ مشہدی نے اس افسانے میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ان کی تمام کہانیاں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔

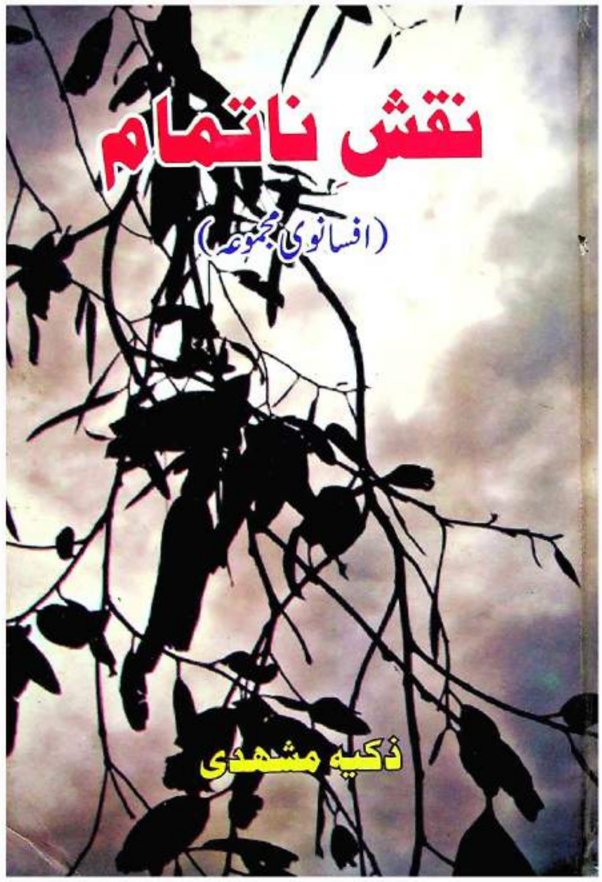

ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا پلاٹ سادہ اور غیر پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔دورانِ قرأت قاری کو کہیں بھی کوئی الجھن محسوس نہیں ہوتی۔ذکیہ مشہدی کے یہاں واقعات کو ترتیب دیتے وقت کہانی کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔اسی وجہ سے ان کے افسانے قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔اس ضمن میں ان کے اکثر افسانے اور خاص کر تھکے پاؤں، پائل اور تیسری راکھی اہمیت کے حامل ہیں۔

ذکیہ مشہدی کے افسانوں کے کردار حالات وواقعات کے موافق ہوتے ہیں۔افسانے کے کردار روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے افراد سے مشابہت رکھتے ہوں تو افسانہ دلچسپ ہوتا ہے۔ذکیہ مشہدی کے افسانوں کی دلچسپی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ان کے کردار حالات اور ان افراد کے موافق ہوتے ہیں جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں۔مثال کے طور پر افسانہ تھکے پاؤں کے کردار رتنا،صوفیہ، میناکشی،مسز کھنہ،مسز ماتھر،مسز جھا،وغیرہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے افراد سے مشابہت رکھتے ہیں۔رتنا پیشہ سے استاد ہے اور اس کا کردار اس کی بول چال اس کے اٹھنے بیٹھنے، اس کے پیشہ کے مطابق دکھایا گیا ہے۔صوفیہ اس کی سہیلی ہے۔سہیلیوں کے بیچ میں جو رشتہ ہوتا ہے جو باتیں ہوتی ہیں وہی صوفیہ کے کردار سے ظاہر ہوتی ہیں۔میناکشی رتنا کی شاگرد ہے اور اس کی چال ڈھال وہی ہے جو ایک شاگرد کی اپنے استاد کے تئیں ہوتی ہے۔باقی عورتیں سماج کی عام عورتوں کی طرح ہیں جو ہر وقت اپنے لباس کے متعلق فکر مند رہتی ہیں اور اسی متعلق باتیں بھی کرتی ہیں۔ذکیہ مشہدی کے کرداروں کے درمیان مکالمہ بھی کرداروں کے حسب حال ہوا ہے۔ہر مکالمہ چاہے وہ عورت کی زبانی ہو یا مرد کی، وہ ہمارے سماجی اور معاشرتی نظام کی حقیقت بیان کرتا ہے۔غیر ضروری مکالمہ نگاری سے پرہیز کیا گیا ہے۔غیر ضروری مکالمہ نگاری افسانے کو بے جان بنا دیتی ہے۔ذکیہ مشہدی کے کرداروں کی آپسی بات چیت سے کہانی کا پورا نقشہ قاری کے ذہن میں واضح ہو جاتا ہے۔ہر کہانی لکھنے والے کا ایک خاص نقطہ نظر ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر وہ کہانی تخلیق کرتا ہے۔

ذکیہ مشہدی کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔متوسط گھرانے کی عورتوں کو کیا مسائل درپیش ہیں، کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑھتا ہے، سماج میں ان کی قدر و منزلت کیا ہے ان تمام مسائل کو اجاگر کرنا ان کی کہانیوں کا مقصد معلوم ہوتا ہے۔ان کا مقصد عورت کی نفسیات اور اس کی خانگی زندگی کے معاملات کو پوری دردمندی کے ساتھ پیش کرنا ہے۔اپنے افسانوں میں ذکیہ مشہدی نے عورت کے مختلف رشتوں کی صورتیں جیسے ساس، بہو، نند، ماں، بیٹی، پھوپھی، وغیرہ کے جذبات کو بڑی ہمدردی اور دلجوئی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ذکیہ مشہدی کے افسانے آغاز، اختتام اور اسلوب و بیان کی عمدہ مثال ہیں۔ان کے افسانے ابتدا ہی سے قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور کہانی کے ختم ہونے پر قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ان کی افسانوی زبان عمدہ ہے زود نویسی سے پرہیز کیا گیا ہے۔زیادہ سے زیادہ بات کم سے کم لفظوں کے ذریعہ ادا کی گئی ہے۔

الغرض ذکیہ مشہدی اردو افسانہ نگاری میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ان کے افسانے فکر، احساس، ہمدردی سے مملو ہوتے ہیں۔پلاٹ، کردار اور مکالمہ نگاری کے اعتبار سے ان کے افسانے کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

محمد عمر، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، اگنو، نئی دلی

Mohd Umer
Room No 07
Sutlej Hostel, JNU
New Delhi-110067
Mob: 9103338213

جہانِ نسواں

جاسی اختر

عقیلہ کی افسانوی کائنات "بکھرے رنگ" کے آئینے میں

اردو افسانے کی روایت اگر چہ زیادہ پرانی نہیں ہے مگر اُس کے باوجود ہمارے یہاں کچھ ایسے تخلیق کار موجود ہیں جنھوں نے ایسے اعلیٰ پایے کے افسانے تخلیق کیے ہیں جو عالمی سطح کے افسانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، غلام عباس، انتظار حسین وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح عالمی ادب میں خواتین افسانہ نگار مرد افسانہ نگاروں کے دوش بدوش چل کر قابل قدر خدمات انجام دے چکی ہیں، اسی طرح ہمارے یہاں بھی خواتین فنکاروں نے مردوں کے دوش بدوش اپنے ادبی سفر کو سرگرم رکھا ہے۔ لیکن ان کی توجہ خاص طور پر عورتوں کے مسائل کے ارد گرد رہی ہے۔ ان میں رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، رضیہ سجاد ظہیر وغیر قابل ذکر خواتین افسانہ نگار شامل ہیں۔ اسی طرح موجودہ دور میں ایک ابھرتی ہوئی افسانہ نگار ڈاکٹر عقیلہ ہیں جنھوں نے عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و جبر، سماجی نابرابری، استحصال اور دیگر گھریلو مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

"بکھرے رنگ" ڈاکٹر عقیلہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 2020 میں منظر عام پر آیا ہے اس افسانوی مجموعے میں کل گیارہ (11) کہانیاں ہیں اور یہ مجموعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا ترجمہ مصر میں "الالوان المبعثرت" کے عنوان سے سماح حسن جامعہ عین شمس نے کیا ہے۔ موضوعاتی اور اسلوبی سطح پر یہ ایک نہایت ہی اہم تخلیقی فن پارہ ہے۔ حاشیائی عناصر، جس کی ایک مثال عورت بھی ہے، کو جن فکشن نگاروں نے مرکز میں لا کھڑا کر کے وقعت اور اہمیت بخشی، ان میں ڈاکٹر عقیلہ کا نام بھی کسی اہمیت سے خالی نہیں۔

"پیڑ کا جن" اسی مجموعے کی ایک بہترین کہانی ہے جس میں اُنھوں نے سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کو بیان کیا ہے۔ افسانے کا کردار برکت علی جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھا۔ لیکن اپنی بیوی رقیہ بیگم سے نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ رقیہ بیگم اگر چہ شوہر کے ہر کام کو بڑی ہی خوش اسلوبی شوق اور محنت سے بخوبی انجام دیتی ہے مگر اُس کے باوجود برکت علی رقیہ بیگم کو بات بات پر ڈانٹتا ہے اور اُسے ہر بات پر پریشان کرتا ہے۔ اِن حرکتوں کی وجہ سے رقیہ بیگم تنگ آ کر جن کا روپ اختیار کر کے برکت علی کی خوب پٹائی کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے برکت علی کی انانیت اور غصہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ رقیہ بیگم کا خیال رکھنے لگتا ہے۔ کہانی کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

> "برکت علی ڈر کے مارے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ مجھے چھوڑ دو! اللہ کے واسطے مجھے معاف کرو! برکت علی گڑ گڑانے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر رقیہ بیگم کے منہ سے نکل پڑا: مگر ایک شرط پر تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ معاف کر سکتا ہوں۔۔ اگر تم وعدہ کرو کہ تم رقیہ بیگم کو آئندہ نہیں ستاؤ گے اور اب سے گھر کا سارا کام بھی تم خود کرو گے۔۔۔ برکت علی نے جلدی سے جواب دیا 'مجھے منظور ہے' مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔۔۔ بس مجھے چھوڑ دو۔۔۔ ٹھیک ہے میں جا رہا

ہوں۔۔لیکن یاد رہے سامنے والا پیڑ ہی میرا گھر ہے میں
تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھوں گا۔ اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو
یاد رہے۔ جن نے انگلی دکھاتے ہوئے کہا!''(۱)

(۱) (پیڑ کا جن' ص:67)

برکت علی نے اگر چہ اپنی بیوی رقیہ بیگم کو ڈرا کے رکھا تھا لیکن رقیہ بیگم کا یہ روپ دیکھ کر اُسے سمجھ آتا ہے کہ میں اپنی بیوی پہ کتنا ظلم کرتا تھا اسی لیے وہ رقیہ بیگم سے معافی مانگ کر ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ پیار کا رشتہ ہوتا ہے اور عورت پیار کی بھوکی ہوتی ہے لیکن اِس کے برعکس جب اُس کا شوہر اُسے ڈرا دھمکا کر رکھے تو عورت پھر ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہے جس سے وہ شوہر کا پیار پا سکے۔ چاہے اُس کے لیے اُسے کسی بھی روپ کا سہارا لینا پڑے۔

'بکھرے رنگ' کے نام سے مجموعے میں شامل افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک بہترین افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں مردوں کی ان وحشیانہ حرکتوں کو جو آئے دن معصوم لڑکیوں کے ساتھ وہ روا رکھتے ہیں، کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانہ کے مرکزی کردار سیما جو شادی سے پہلے ہی اپنی عصمت کسی اجنبی کالے کپڑے اور چہرے پر کالا ماسک لگائے ہوئے درندے کے ہاتھوں کھو بیٹھتی ہے لیکن سیما کے ماں باپ اس واقعہ کے بارے میں کسی کو نہیں بتاتے۔ اگر چہ سیما اور اِن کے ماں باپ ایسے درد سے گزر رہے تھے اور اُن کا کلیجا پھٹا جا رہا تھا لیکن اپنی اور اپنی بیٹی کی عزت اور سماج کے ڈر میں رہنے کے خاطر وہ اس درد کو بیان نہیں کر پاتے اور سیما کی شادی آنند نام کے لڑکے سے ہو جاتی ہے۔ لیکن سہاگ والی رات کو ہی سیما کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کالے چہرے والا آدمی کوئی اور نہیں بلکہ آنند ہی تھا کیونکہ وہ آنند کی انگوٹھی پہچان لیتی ہے۔

ملاحظہ ہو افسانے سے یہ عبارت:

'آنند نے سیما کو بیڈ پر بٹھایا اور پانی کا گلاس آگے بڑھایا
گلاس پکڑتے ہوئے جوں ہی سیما کی نظر آنند کی انگوٹھی پر
پڑی تو گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر ٹوٹتے ہوئے سیما کے
خواب رنگ ارمانوں کو بھی چکنا چور کر گیا''۔

(بکھرے رنگ' ص:56)

عورت ہمیشہ بے بس ہوتی ہے وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پاتی ہے۔ سیما کا ہر خواب شادی کے دن ہی ٹوٹ جاتا ہے جب اُس کو پتہ چل جاتا ہے کہ آنند ہی وہ بد بخت ہے جس نے اُسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا کیونکہ شادی ایک لڑکی کا سب سے بڑا خواب ہوتا ہے اور اِس خواب کو وہ سجا کے رکھتی ہے۔ لیکن شادی جب اُس درندے سے ہو جائے جس نے پہلے ہی لڑکی کی عصمت کو تار تار کیا ہو تو ایک لڑکی کے لیے اِس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارے سماج میں آئے دن ایسے واقعات پیش آتے ہیں جب اس طرح کے درندہ صفت شخص سے شادی ہو جائے تو ایک لڑکی کیا توقع اس شخص سے رکھ سکتی ہے جس میں اس طرح کی درندگی بھری ہوئی ہو اس دوران لڑکی اور گھر والوں پر کیا کچھ گزرتی ہے اس کا اندازہ افسانے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

''طلاق'' بھی موضوع کے اعتبار سے ایک بہترین افسانہ ہے جس میں ایک طلاق شدہ عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ شاداب اور پری جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور گھر والوں کی رضامندی کے بغیر کورٹ میریج کر لیتے ہیں۔ شاداب ایک غصہ والا آدمی تھا اور ذرا ذرا سی بات پر غصہ کرتا تھا۔ ایک دن ایسے ہی غصہ میں آ کر اپنی بیوی پری کو تین بار زبانی طلاق دے دیتا ہے اور اُن تین لفظوں نے ان کی پوری زندگی بدل دی، اب شاداب بہت پچھتا رہا ہے۔ افسانے کا ایک اور کردار رحمت چاچا بہت ہی نیک اور پرہیز گار ہوتا ہے اب شاداب کو حلالہ کے لیے رحمت چاچا ہی مناسب لگتا ہے اور رحمت چاچا جیسا نیک انسان بھی لالچ میں آ کر پری سے ایک رات کے لیے نکاح کر لیتا ہے۔ عبارت ملاحظہ کیجیے:

''شاداب' اپنے بستر پر لیٹ کر بے چینی سے کبھی اس طرح کروٹ لیتا اور کبھی اُس طرف۔ لیکن اُسے کسی کروٹ چین نہیں آرہا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ جیسے تیسے کر کے رات کٹی اور فجر کی اذان ہوئی تو شاداب دوڑتے ہوئے رحمت چاچا کے فلیٹ پر گیا۔۔ چلے گئے لیکن کہاں' کیوں' بھائی پتہ نہیں کہاں گئے؟ کہہ رہے تھے بیگم کو لے کر دوسرے شہر جا رہا ہوں اب وہیں رہیں گے''۔

(طلاق ص:72)

شاداب اگر چہ پوری رات سو نہیں پایا اور یہ ایک رات ہزار راتوں کے برابر لگ رہی تھی اور پری کو ملنے کے لیے بے چین تھا لیکن رحمت چاچا جیسا نیک شخص بھی آخر میں ایک مجبور و بے بس عورت کا فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ایک کھلونے کی طرح عورت کبھی اُس کے ہاتھوں میں رہی کبھی اِس کے ہاتھوں میں۔ ہمارے سماج میں ایسے کئی واقعات پیش آتے ہیں، جہاں مرد ذرا سی بات پر عورت کو طلاق دیتا ہے اور پھر عمر بھر اُن کو پچھتانا پڑتا ہے اور عورت بے چاری کچھ نہیں کر پاتی۔ عورت چاہے کتنی بھی نیک اور شوہر کی فرمانبردار کیوں نہ ہو، لیکن اُس کو یہ زہر پینا ہی پڑتا ہے۔ ہر بار اُسے اپنی خوشیاں قربان کرنی پڑتی ہیں۔

''سرجو'' ایک ایسی کہانی ہے، جس میں مصنفہ نے ایک ایسے مسئلے کی عکاسی کی ہے کہ جہاں دھوکے اور فریب میں مبتلا انسان نیک اور رحم دل انسان کو اپنے جال میں پھنسا کر اُن کا گھر بار مال و دولت لوٹ کر لے جاتا ہے۔ افسانے کا کردار کلیم صاحب ایک دولت مند انسان ہونے کے ساتھ ساتھ نیک، ایماندار اور سخی ہوتا ہے اور سرجو جیسے غریب آدمی پر ترس کھا کر اپنے گھر میں رہنے کی پناہ دیتا ہے اور اُس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ کلیم صاحب تجارت کے سلسلے میں دلی جاتے ہیں اور گھر کی ساری ذمہ داریاں سرجو کو سونپتے ہیں۔ لیکن سرجو کلیم صاحب کی غیر حاضری میں دوکان کا سارا مال لوٹ کر بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی دھوکا دے کر فرار ہو جاتا ہے۔ ذرا یہ عبارت دیکھیے:

''دن گزرتے گئے لیکن سرجو واپس نہیں آیا اور کلیم صاحب دلّی سے واپس بھی آگئے انھوں نے سرجو کی کھوج خبر کی لیکن سرجو کا کوئی اتا پتہ نہیں چلا۔ دوکان کا بھی سارا مال غائب تھا لوگوں سے بھی سرجو نے کلیم صاحب کے نام پر ادھار لیا تھا اور پڑوس کی لڑکی کو بن بیاہی ماں بنا کر سب کو دھوکا دے کر رفو چکر ہو گیا تھا''۔ (سرجو، ص:97)

اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سرجو نے کئی لوگوں کے سامنے شرافت کا ڈھونگ رچا کر ان سب کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اُن کے دلوں کو چوٹ پہنچائی۔ سرجو کی طرح ہمارے سماج میں کئی دھوکے باز موجود ہیں جو معصوم لوگوں کو خاص طور پر عورتوں کو بیوقوف بنا کر سب کچھ لوٹ کے لے جاتے ہیں۔

''شادی کا تحفہ'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں آج کے دور میں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم لڑکیوں کو سوشل میڈیا کے غلط استعمال سے اُن کے کردار کو داغ دار بنا دیا جا رہا ہے اور پھر سماج اُن پاکیزہ لڑکیوں کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتا ہے جس میں اُن کا کوئی قصور نہیں ہوتا ہے۔ افسانے کے کردار مریم کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آتا ہے، جو اُن کے کردار کو مسخ کر دیتا ہے۔ مریم خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ کالج میں ہر معاملے میں سب سے آگے ہوتی ہے۔ اُن کے والدین اُن پر فخر کرتے ہیں لیکن کالج کے کچھ بد ذہن اور بد بخت لڑکے ایک غلط تصویر کے ذریعہ اُس کے کردار کو داغ دار بنا دیتے ہیں اور بدنامی کی وجہ سے اُس کے گھر والے اُن کی شادی ایک ایسے بوڑھے آدمی سے کر دیتے ہیں جس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور جس کے بچے بھی ہوتے ہیں۔ مریم اگر چہ ماں باپ کی عزت کی خاطر یہ شادی کرنے پر راضی ہو جاتی ہے لیکن وہ بوڑھا خاوند بھی مریم کی معصومیت پر شک کر کے اُسے طلاق دیتا ہے۔ شہلا جو کالج کے زمانے میں مریم کی سہیلی تھی جب بازار میں مریم کو دیکھتی ہے تو اپنے بھائی ماجد کو سب کچھ بتاتی ہے۔ کہ مریم بے قصور تھی۔ افسانے سے یہ عبارت ملاحظہ ہے:

''چال یہ چلی کہ اُن لڑکوں میں سے ایک لڑکا جو اکثر مریم کو چھیڑتا تھا معافی مانگنے کے بہانے اپنے گھر بلایا اور اُس کو بدنام کر دیا شہلا نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا لیکن میں جانتی ہوں کہ مریم ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ بے قصور اور معصوم ہے۔ ماجد بھائی مریم کو اُس چیز کی سزا ملی جو اُس نے خطا کی ہی نہیں۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر شہلا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی''۔

(۵)(شادی کا تحفہ'' ص:115)

مریم کے کردار کو اگر چہ سماج میں شک کی نظر سے دیکھا گیا لیکن اُس کے باوجود بھی شہلا مریم سے ہمدردی رکھتی ہے اور مریم کی معصومیت کے بارے میں اپنے بھائی ماجد کو بتاتی ہے اور ماجد مریم کو اپنی بیوی بنا کر گھر لاتا ہے۔ یعنی ہمارے معاشرے میں ماجد کی طرح کئی ایسے آدمی موجود ہیں جن کی سوچ بہت اچھی ہوتی ہے جو عورت کی عزت کرنا جانتے ہیں اور

عورت کو سماج میں ایک مقام دیتے ہیں اور عورت کی زندگی میں بہار لے آتے ہیں۔

''چال'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایسے مسئلے کی عکاسی کی گئی ہے جو ہمارے سماج میں پرانے زمانے سے ہی چلتا آ رہا ہے یعنی ساس بہو کے جھگڑے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں۔ افسانے میں بہو کرن کی ایک چال کے ذریعہ ماں بیٹے کے عظیم رشتے کو پامال کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ افسانے کے کردار سلیم جو اپنی ماں کا خدمت گذار ہوتا ہے اور ماں کا بہت ہی خیال رکھتا ہے اور اُسے خوش رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ سلیم کی ماں کی آخری خواہش یہی ہوتی ہے کہ کب سلیم کی شادی ہو اور بہو گھر میں آ جائے۔ لیکن کرن کے آتے ہی کرن سے یہ برداشت نہیں ہوتا ہے کہ اُس کا شوہر ہر کام کرنے سے پہلے ماں کی اجازت لے اور اُس کا خیال رکھے اِسی حسد کی وجہ سے وہ میکے چلی جاتی ہے جہاں اُس کی ماں اُسے ایک چال سمجھاتی ہے افسانے سے اس کی سچی تصویر ملاحظہ کیجیے:

> ''میں نے سلیم کو فون کر دیا ہے وہ تجھے لینے آ رہا ہے لیکن خیال رہے چال ایسی چلنا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ سمجھ گئی بیٹی! جی امی!''۔(چال''ص:135)

اِس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کرن کی ماں ہی کرن کو یہ چال سمجھاتی ہے کہ ایک عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے۔ کرن کی ماں اگر کرن کو اِس غلط کام میں ساتھ نہ دیتی بلکہ اِس کے بدلے صحیح طریقے سے سمجھاتی شاید کرن ایسا کرنے کی ہمت نہیں کرتی۔ لیکن اِس کے باوجود وہ اپنی بیٹی کو چال سمجھاتی ہے جس کی وجہ سے ماں بیٹے کے رشتہ میں ایک درار پیدا ہو جاتی ہے جو سلیم ماں کا اتنا خدمت گزار ہوتا تھا اب وہ اپنی ماں کو اولڈ ایج ہوم بھیجنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ایک چال کی وجہ سے ماں بیٹے کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ ماں جو دنیا کی سب سے عظیم ہستی ہے لیکن ایک ماں ہی دوسری ماں کو اولڈ ایج ہوم بھجواتی ہے اور ہمارے سماج میں کرن کی ماں کی طرح بہت سی عورتیں موجود ہیں جو اپنی بیٹیوں کی صحیح تربیت نہیں کرتی۔ بلکہ انھیں غلط مشورہ دے کر اُن کے گھر کو برباد کرتی ہیں اور وقت آنے پر اُن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

اُن کے علاوہ قاتل، فریب، آخر میں نے پالیا تجھے، جھوٹی سی محبت، پچھتاوے کا بھنور جیسے افسانے بھی افسانوی مجموعے ''بکھرے رنگ'' میں شامل ہیں۔ ''بکھرے رنگ'' ڈاکٹر عقیلہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اِس مجموعے کے افسانوں میں گرچہ کئی خامیاں نظر آ رہی ہیں لیکن اِس کے باوجود کچھ افسانوں میں مصنفہ نے اپنی فنی بصیرت و گہرے مشاہدے کو پیش کیا ہے جو سراہنے کے قابل ہیں۔ ڈاکٹر عقیلہ چونکہ خود بھی ایک عورت ہیں اور سماج میں عورت کے ساتھ پیش آنے والے ظلم و ستم کو بہت قریب سے دیکھتی چلی آ رہی ہیں اور اِن ظلم و ستم کو محسوس کر کے اپنے قلم سے انھیں وجود بھی بخشتی ہے۔ ایک ادیب جب کسی واقعہ کو دیکھ کر پوری طرح متاثر ہوتا ہے اور وہ واقعات اُسے قلم اٹھانے پر مجبور کرتے ہیں اور جب تک وہ اُن واقعات کو قاری تک نہ پہنچائے اُسے چین نہیں آتا۔ لگتا ہے کہ وہ اِن ظلم و ستم سے بہت شدت سے متاثر ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے ڈاکٹر عقیلہ کی افسانہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''افسانہ نگاری کے ذریعہ انھوں نے خواتین کے مسائل کو ابھارا ہے۔ وہ ایک صحتمند معاشرے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ اُن کے افسانوں کے کردار ہمارے ماحول و معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں دلچسپ مکالمہ نگاری کا عنصر موجود ہے۔ انھوں نے علامتیت، تجریدیت اور استعاریت کے بجائے بیانیہ اسلوب میں افسانے لکھے ہیں جو قاری کے ذہن و دل میں بہ آسانی اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں''۔(تجزیاتی مطالعہ ''بکھرے رنگ'' ڈاکٹر عقیلہ ص:38)

ڈاکٹر عقیلہ افسانہ نگاری میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ امید قوی ہے کہ آنے والے دور میں اُن کے کئی افسانوی مجموعے قارئین کو پڑھنے کو ملیں گے اور اِس کے ساتھ ساتھ اپنی چند خامیوں پر نظر ثانی کر کے آنے والے دور میں اُن کے بہترین افسانوی مجموعے منظر عام پر آئیں گے اور وہ اپنا تخلیقی سفر بھی رواں دواں رکھ کر افسانوی ادب میں اپنا نام پیدا کریں گی۔ ڈاکٹر عقیلہ اگر چہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں درس تدریس کے حوالے سے شعبہ عربی میں کام کر رہی ہیں لیکن اردو ادب کے ساتھ اُن کی والہانہ محبت افسانوی مجموعہ میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے اور یہ اس بات کا کھلا اعتراف بھی ہے کہ انھیں اردو ادب سے کس طرح کی وابستگی ہے۔ امید ہے یہ محبت آنے والے دور میں اور بھی بڑھ جائے گی اور اُن کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئیں گے۔

❑❑❑

Jacy Akhter
Research Scholar
Dept. of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University
Rajouri-185234 (J&K)

مائشہ

مصنوعی ذہانت کے منفی اثرات

مصنوعی ذہانت (AI)، انسانی ذہانت کی تخلیق ہے جو مشینوں خاص طور پر کمپیوٹر سسٹم کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ مصنوعی ذہانت کا مفہوم خود کار ہونا ہے۔ درحقیقت مصنوعی ذہانت مشینوں کو یہ صلاحیت بخشتی ہے کہ وہ خود سے اپنی ذہانت کا استعمال کرکے انسانوں کی طرح فیصلے کر سکیں۔ مصنوعی ذہانت کا تذکرہ آج کل ہر ایک کی زبان پر جاری ہے۔ کمپیوٹر سائنس کے اس میدان میں ہر روز حیرت انگیز ایجادات ہو رہی ہیں۔ مصنوعی ذہانت سے ہر کوئی متاثر نظر آرہا ہے اور اس کا اثر ہر انسان کی زندگی پر دکھائی دینے لگا ہے۔

آج مصنوعی ذہانت نے ہماری دنیا کو پوری طرح تبدیل کر دیا ہے۔ آج ہم شہروں میں رہتے ہیں، گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں اور اسی طرح ہمارے لیے بہتر تعلیم اور صحت کی سہولیات دستیاب ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج ہم خود مختار ہیں، اور یہ سب کچھ براہ راست یا بالواسطہ طور پر مصنوعی ذہانت کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ بلاشبہ اس کے بہت زیادہ فوائد ہیں مگر ان فوائد کی وجہ سے ہمیں اس بات سے غافل نہیں ہو جانا چاہیے کہ انسانی سماج پر اس کے بہت زیادہ منفی اثرات بھی ہیں۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ اس کی کیا قیمت ہے؟ یہ 30000 امریکی ڈالر تک فی سافٹ ویئر ہے پچھلے سال اس کی کل لاگت 142 بلین ڈالر تھی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ماحول کو مصنوعی ذہانت کی کیا قیمت چکانی پڑتی ہے؟ اس بات کا پتہ چلا ہے کہ جی پی ٹی 3 چیٹ میں استعمال ہونے والے لینگویج ماڈل جی پی ٹی نے صرف ٹریننگ میں 7 لاکھ لیٹر میٹھا پانی استعمال کیا ہے۔

عظیم طبیعیات دان اسٹیفن ولیم ہاکنگ نے ہمیں بارہا خبردار کیا ہے کہ مصنوعی ذہانت کا مکمل فروغ، نسل انسانی کے خاتمے کا سبب بن سکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے ڈویلپرز دلیل دیتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت انسانوں کے لیے کافی فائدہ مند ہے اور اس کا مقصد لوگوں کے کاموں کو آسان بنانا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ بالکل نہیں، معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ اگر ہم غور کریں تو مصنوعی ذہانت کا منفی پہلو ہمارے سامنے اجاگر ہو کر آتا ہے۔ پچھلے سال سائبر کرائم کے شکار ہونے والے مصنوعی ذہانت صارفین کی شرح 68% بڑھی۔

صرف ایک مثال پر غور کیجیے، آج کل طلبا اپنی تخلیقات اور تحقیقی اسائنمنٹ کی تیاری میں چیٹ GPT کا استعمال کر رہے ہیں، حالانکہ وہ اس بات پر دھیان نہیں دیتے ہیں کہ ان معلومات کے صحیح اور غلط ہونے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مصنوعی ذہانت کی وجہ سے طلبا نصابی کتب کو سنجیدگی سے نہیں لیتے ہیں اور ان کی اہمیت وافادیت سے بے خبر ہو کر ان سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔

بلاشبہ، مصنوعی ذہانت کی مدد سے ہم اپنے مقالات اور دیگر تخلیقی کام چند منٹ میں پورا کر سکتے ہیں لیکن کیا کبھی ہم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر ہم اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کریں گے تو ہم آہستہ آہستہ

اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو برباد کردیں گے اور ایک دن آئے گا جب ہم اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے اہل نہیں رہیں گے اور کند ذہنی کے شکار ہوجائیں گے۔

آج صرف مصنوعی ذہانت کی وجہ سے بہت سے لوگ بینائی کے مسائل کا شکار ہورہے ہیں۔ آج کل لوگ ہاتھ سے لکھنے سے زیادہ ٹائپنگ کو ترجیح دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی ہینڈ رائٹنگ خراب ہورہی ہے۔ لوگ کھانا بنانے یا ریسٹوراں میں جا کر کھانے کے بجائے آن لائن آرڈر دینا پسند کرتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی وجہ سے انسان معاشرہ سے الگ تھلگ ہوتا جارہا ہے اور وہ خود کی دنیا میں اس قدر مشغول رہتا ہے کہ اس کو اپنے اردگرد کی بھی خبر نہیں رہتی ہے۔

آج کل بچے اور یہاں تک کہ بزرگ بھی ویڈیو گیمز کے عادی ہو گئے ہیں جس کے نتیجے میں کئی طرح کے منفی اثرات ہورہے ہیں، ان کو موٹاپا، سماجی بے چینی، خودکشی کے خیالات، ڈپریشن اور بہت سی دیگر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ چوبیس گھنٹے صرف اسکرین کے سامنے بیٹھ کر ہم تخلیقی کام کر سکتے ہیں؟ یقینی طور پر یہ بہت مشکل معاملہ ہوگا۔ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر مصنوعی ذہانت اچانک بند ہوجائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اس مصنوعی ذہانت کے جال میں اس قدر پھنسا ہوا ہے کہ اگر کسی دن یہ بند ہوجائے تو لوگ مؤثر طریقے سے اپنے کام بھی نہیں کر پائیں گے۔ مصنوعی ذہانت کا سب سے بڑا نقصان کیا ہے؟ آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ مصنوعی ذہانت کی وجہ سے کافی لوگوں کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت کا فائدہ اٹھا کر مالدار افراد اور بڑی بڑی کمپنیاں معاشی عدم مساوات میں مزید اضافہ کر سکتی ہیں۔

آج کل یہ بات بھی گردش کر رہی ہے کہ بغیر ڈرائیور والی کاروں کو بڑے پیمانے پر متعارف کرایا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں بہت سارے ڈرائیور اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اس طرح ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی تباہ ہوجائے گا۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی خودکار مشینوں کا چلن اس قدر ہوجائے گا کہ وہ انسانوں کی جگہ لے لیں گی کیونکہ یہ خودکار مشینیں انسانوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے اور بغیر تھکے ہوئے کام کر رہی ہوں گی۔

قارئین! اگر آپ کی پرسنل چیٹس (ذاتی بات چیت) سب کے سامنے ظاہر ہوجائیں تو آپ کو کیسا لگے گا؟ آپ کیسا محسوس کریں گی اگر آپ کی ذاتی تصاویر، آپ کے اکاؤنٹ کی تفصیلات اور یہاں تک کہ آپ کے چیٹ بھی سب کے سامنے عیاں ہوجائیں؟ آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ مصنوعی ذہانت کے پاس آپ کی اجازت کے بغیر ہی آپ کے ڈیٹا اور آپ کی ذاتی معلومات کو ذخیرہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ مصنوعی ذہانت انسانی نگرانی نہ ہونے کے سبب غیر متوقع نتائج اور طرزِ عمل کا بھی مظاہرہ کر سکتی ہے۔

دراصل یہ صرف مصنوعی ذہانت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسانوں کا بھی مسئلہ ہے کہ وہ اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ آپ تصور کیجیے کہ اگر مصنوعی ذہانت کو ایسا شخص استعمال کرتا ہے جس کی نیت اچھی نہیں ہو تو وہ آپ کے اکاؤنٹ کو ہیک کر سکتا ہے اور آپ کی ذاتی معلومات کو سب کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اس صورت حال میں آپ کو نہایت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا جو چین میں پیش آیا۔ گوو نامی ایک شخص کو ایک ایسے شخص کی طرف سے ویڈیو کال موصول ہوئی جس نے مصنوعی ذہانت کی مدد سے اس کے دوست کی شکل اور آواز اختیار کی ہوئی تھی۔ اس شخص نے گوو سے تقریباً ساڑھے چار کروڑ یوآن بطور قرض لے لیا۔ پھر اس شخص نے ادائیگی کے جعلی ریکارڈ کا اسکرین شاٹ بھیج کر گوو کو بتایا کہ اس نے رقم واپس کردی ہے۔ بعد میں جب گوو کو پتہ چلا کہ اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع نہیں ہوئی ہے تو اس نے اپنے دوست سے رابطہ کیا۔ اس کے دوست نے اس قسم کے کسی بھی لین دین سے انکار کردیا۔ اس کے بعد گوو کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔

یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہوں کہ مصنوعی ذہانت ہماری شناخت اور خودمختاری کو کم کرتی ہے اور انسان کے وقار کے لیے خطرہ کا سبب بن سکتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ عالمی سطح پر ایسے قوانین اور ضوابط بنائے جائیں جن کی وجہ سے مصنوعی ذہانت کے منفی اثرات پر قابو پایا جاسکے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ انسان کو مصنوعی ذہانت کے تابع بنانے کی جگہ مصنوعی ذہانت کو انسان کے تابع بنایا جانا چاہیے۔ اب یہ آپ کو منتخب کرنا ہے کہ آپ دنیا پر حکمرانی کے لیے مصنوعی ذہانت چاہتے ہیں یا انسانی ذہانت۔

□□□

Mysha
C80/1, Abul Fazal Enclave
Part-II, Shaheen Bagh
New Delhi-110025

ڈاکٹر سُمیّہ ساجد

نظم

کب ذرا سا درد یہ

دل میں اُٹھا
اور میرے پورے
جسم میں پھیل کر
اپنی جڑیں
اِتنی مضبوط کر گیا
کہ
میرا پورا وجود
آج اِس درد کی
چھاؤں میں
پل رہا ہے
میری نسوں میں
یہ درد ہی
لہو بن کر
دوڑ رہا ہے
مجھے زندگی
دے رہا ہے
اگر میں اِس پیڑ کی
شاخوں کو
کاٹ بھی دوں
تو جڑیں میرے جسم میں
موجود رہیں گی
اور اگر میں جڑیں
اُکھاڑ دیتی ہوں
تو میرا پورا بدن
لہُولہان ہو جائے گا
کہ تم نے
دیکھا ہی ہوگا
اگر پیڑ کو
جڑ سے اُکھاڑ دو
تو پاس زمین کی
مٹی بھی
ساتھ ہی
اُکھڑ آتی ہے
اور زمین میں
اُس جگہ
ایک خالی پن کا
احساس رہ جاتا ہے
پھر وہاں کسی
نئے پیڑ کو
پنپنے میں
تھوڑا وقت لگ جاتا ہے

Dr. Sumaiya Sajid
S -17\28, Nadesar Cantt.,
Varanasi - 221002 (U.P)
Email: sumaiyasajid2@gmail.com

نظمیں

ڈاکٹر نورینہ پروین

اجنبی چہرے

معلوم نہیں اس آخری ملاقات میں کیا تھا
جو چپ سی لگ گئی ہے!

ہر خواب ہر خیال اور ہر فکر پر
اک سکوت سا چھا گیا ہے
ایسا لگتا ہے موجوں کی روانی خاموش سی ہو گئی ہے
ایسا لگتا ہے چاند کے پایۂ تکمیل کو
پہنچنے کے غم میں
رات بھی ویران سی ہو گئی ہے
ایسا لگتا ہے تاروں نے بھی کنارہ کشی کر لی ہے

ہر طرف ویرانی ہے، تنہائی ہے، خاموشی ہے
مگر
اک نفسِ تار ہے
جو موت اور زندگی کے درمیان حائل ہے

میرے اطراف جو بستی ہے دنیا اور اس کا شور،
ایسا لگتا ہے وہ بے وقت کی راگنی ہو کر
بلیک ہول میں تبدیل ہو گئے ہیں

کون کہتا ہے اجنبی چہرے سے شناسائی ہوتی ہے؟

Dr. Nurina parveen
Village & Post- Kasenda
Block- Chail,
Distt.- Kaushambi-212202 (U.P)
Mob. No. 7668716712

صدف جمال

چاند "اچھا ساتھی"

چاند میرے ساتھ ساتھ
چل رہا تھا ایک رات
کنکھیوں سے دیکھ۔دیکھ
جھاڑیوں سے جھانک جھانک
چاند میرے ساتھ ساتھ
وہ دیکھو! آگے چل دیا
ارے! ارے پھسل گیا
رکو، رکو ٹھہر گیا
لو جھاڑیوں میں چھپ گیا
چاند میرے ساتھ۔ساتھ
کبھی ادھر کبھی ادھر
ملا وہیں جدھر نظر
ہائے یہ حسیں سفر
کج جب رکی میں رک گیا
چاند میرے ساتھ۔ساتھ
وہ ساتھ ساتھ بھاگتا
وہ ساگروں کو لانگھتا
پہاڑیوں کو پھاندتا
وہ بادلوں میں چھپ گیا
چاند میرے ساتھ ساتھ
چل رہا تھا ایک رات

Sadaf Jamal
Village & Post-Mahmoodabad
District Barabanki-225412(UP)

کہانیاں

ادیب

فرخندہ ضمیر

شادصاحب کو جیسے ہی ہوش آیا انھوں نے اپنے آس پاس دیکھا۔ آنکھوں اور سر کو ہلکی سی جنبش دی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ کئی طرح کے تاروں اور نلکیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دماغ پر زور ڈالا تو انھیں کچھ کچھ یاد آیا۔ پھر سب کچھ روشن ہو گیا۔

ہاں! انھیں یاد آیا۔

بہت شدّت سے انھیں گردے میں تکلیف ہوئی تھی کہ وہ درد کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو گئے تھے اور ان کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

"انھیں یہاں کون لایا؟"

وہ درو دیوار کو غور سے دیکھنے لگے۔

شیشے کے اس پار سے نرس نے دیکھا تو فوراً قریب آئی۔ ڈاکٹر بھی جلدی سے قریب آ گیا۔

"آپ ٹھیک ہیں" ڈاکٹر نے ان کی نبض چیک کرتے ہوئے کہا۔

"جی" شادصاحب نے نحیف آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے نرس کو کچھ ہدایتیں دیں اور دوسرے مریضوں کے بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔

شادصاحب ڈاکٹر اور نرسوں کی مستعدی دیکھ کر، اور جدید سہولیات سے آراستہ I.C.U، صاف صفائی دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ یہ کوئی مہنگا پرائیویٹ ہسپتال ہے۔

"لیکن انھیں یہاں کون لایا؟" یہ ہی سوال ان کے ذہن میں بازگشت کرتا رہا۔

ان کی اتنی حیثیت کہاں کہ وہ اس ہسپتال کے اصراف برداشت کر سکیں۔ وہ تو ایک ادیب ہیں۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ کہاں، انھیں تو سرکاری ہسپتال کے علاج میں ہی چھینکیں آ جاتی ہیں کہ وہاں صرف ڈاکٹر کی فیس ہی تو نہیں لگتی۔ دوائیاں وغیرہ تو سب بازار سے خریدنی پڑتی ہیں۔ وہ ایک اسکول ٹیچر اور ادیب ہی تو تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کئی اعلیٰ درجہ کی تخلیقات صفحۂ قرطاس پر اتاری تھیں۔ ادبی دنیا میں ان کا مقام تھا۔ ان کی ادبی خدمات پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، میکش ایوارڈ، غالب ایوارڈ وغیرہ سے نوازا گیا تھا۔ ان کے کمرے کے شوکیس میں ایوارڈ کا روز بروز اضافہ ہو رہا تھا لیکن مالی حالت جوں کی توں تھی۔ 4/ بچے، بیوہ بہن اور اس کے دو بچے غرض ایک بڑے کنبہ کے وہ پالنہار تھے۔

انھیں احساس تھا کہ اگر وہ ہندی یا انگریزی کے ادیب ہوتے تو ان کی زندگی مفلسی کے چراغ کی مانند نہیں ہوتی۔ وہ بھی شان سے سہیل سیٹھ، چیتن بھگت، اروندھتی رائے، نرمل ورما، اشوک واجپئی جیسی شاندار زندگی بسر کرتے۔ لیکن کیا کریں ان زبانوں پر عبور حاصل تھا لیکن اپنے مزاج سے مجبور تھے۔ مادری زبان اردو سے اس حد تک محبت تھی کہ کسی اور زبان میں لکھنے کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ذہنی تسکین انھیں اردو سے ہی ملتی تھی۔ اس لیے مفلسی بھی مقدر تھی۔ اردو کے ادیب تو بیچارے اپنی

تخلیقات شائع کرانے کے لیے اپنے گردے کی رقم خرچ کرتے ہیں اور مفت کتابیں بانٹتے ہیں۔

جب انھیں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا اس کے بعد کوئی کوئی میگزین انھیں معاوضہ دے دیتی۔

ان کی کتابوں کے ترجمے ملک کی مختلف زبانوں میں ہونے لگے۔ اب انھیں ہندی، انگریزی والے بھی عزّت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا،لیکن پھر بھی ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اپنا گردہ ٹرانس پلانٹ کروا سکتے تھے۔ تکلیف دن بہ دن شدید ہوتی جا رہی تھی۔گھر کی بھی ذمّہ داریاں تھیں۔

دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کی تربیت شریکِ حیات نے اچھی کی تھی۔ وہ سیلف میڈ بچے تھے اور اپنی پڑھائی کا خرچہ اسکالرشپ اور ٹیوشن سے نکالتے تھے۔ بیوہ بہن کے بچے بھی ایسے ہی تھے۔

ورنہ شاد صاحب تو پھکّڑ قسم کے انسان تھے۔غریبی میں پھاگ کھیلنے والے......

ہمیشہ دوسروں کی مدد کو تیار رہتے۔ خاص کر اپنے ادیب دوستوں کی مدد کھلے دل سے کرتے۔ پیسہ سے نہیں تو خدمات سے۔

گاندھی اور آزاد کے معتقد تھے۔

"لیکن انھیں اتنے مہنگے ہسپتال میں لایا کون؟"

یہی سوال بار بار ذہن میں اٹھتا رہا۔

شام کو بیوی کے آتے ہی انھوں نے یہ سوال پوچھا۔

"مجھے یہاں کون لایا؟

" آپ کے دوست "

"میرے دوست!" انھیں حیرت ہوئی۔

"ہاں اس وقت جس طرح آپ کے دوستوں نے مدد کی ہے۔ میں بتا نہیں سکتی۔" بیوی آبدیدہ ہوگئیں۔ یہ ہی تشکّر کے آنسو شاد صاحب کی آنکھوں میں بھی چمکنے لگے۔

دوسرے دن عظمی صاحب ملنے آئے تو شاد صاحب نے گلوکوز کی نلکی لگا ہوا ہاتھ اٹھایا اور شاد صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ آنکھوں سے موتی رولنے لگے۔ عظمی صاحب نے ان کے بولنے سے پہلے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ وہ جانتے تھے کہ شاد صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں آخر ان کے بچپن کے یارِ غار تھے۔

"ڈاکٹر نے بولنے سے منع کیا ہے۔"

"اچھا میرے رفیقوں کی خیریت تو سناؤ۔"

"سب خیریت سے ہیں، تم جلدی سے صحتیاب ہو جاؤ پھر یارانِ کہن کی محفلیں سجیں گی۔" عظمی صاحب کچھ دیر اور بیٹھتے لیکن نرس نے آکر اٹھا دیا۔

"ملنے کا وقت ختم ہوا۔"

"سسٹر آپ لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اپنوں کی قربت مریض کے لیے دوا سے زیادہ چارہ گری کرتی ہے۔" اعظمی صاحب کل صبح تک کی تنہائی کے عذاب سے خائف تھے۔

"انفیکشن کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لیے مریض کو زیادہ لوگوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے" نرس نے ان کا بی۔ پی چیک کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دنوں بعد انھیں روم میں شفٹ کر دیا۔ اب طبیعت قدرے بہتر تھی۔

دوست احباب ملنے آنے لگے۔ انھیں اپنے دوستوں کی محبت کا احساس ہو گیا تھا۔ ان کا گردہ ٹرانس پلانٹ کر دیا گیا اور ڈونر کون ان کا پیارا دوست " راہی،، وہ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن اب زندگی مسکرا رہی تھی۔

ایک دن ہسپتال میں کچھ زیادہ ہی گہما گہمی تھی۔ اسٹاف بہت زیادہ مستعد۔

نرس سے پتا چلا کہ۔

"مرکزی کابینہ منسٹر ہیں۔ ایسا بخار ہے کہ اترتا ہی نہیں اور بے ہوشی ٹوٹتی نہیں۔ تمام اعضاء بیکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر پریشان! ان کی قابلیت پر نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ روز سیاست دانوں کی آمد اور ان کے پروٹوکول سے اسٹاف کی کارگردگی میں خلل پڑ رہا تھا۔

عظمی صاحب آئے تو حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہوئی۔

"منسٹر صاحب کو علاج کے لیے امریکہ کیوں نہیں لے جا رہے؟ ملک میں تو غریب عوام علاج کراتے ہیں۔" شاد صاحب سیاست اور سیاست دانوں سے بہت نالاں تھے۔

"پہلی فرصت میں لے جائیں لیکن کچھ تو سدھار ہو۔ غریب عوام کی بد دعائیں ہیں کہ زر و جواہر سے بھری تجوریاں بھی کسی کام نہیں آ رہی ہیں"۔ عظمی صاحب نے بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

کیونکہ ان دونوں نے سیاست دانوں کے در پر علاج کے لیے کتنے چکّر لگائے کہ۔

ایک عظیم ادیب موت اور زندگی کی کشمکش میں خوار ہو رہا ہے، اگر سرکاری امداد مل جائے تو زندگی کی ہاری ہوئی بازی جیت جائے اور اعلی

تخلیقات وجود میں آئیں جو کسی بھی ملک اور قوم کا سرمایہ ہوتی ہیں۔۔۔۔
لیکن ان کی موٹی چمڑی پر کچھ اثر نہ ہوا۔

اخبارات میں منسٹر صاحب کی علالت کے متعلق روز بیان جاری ہوتے۔ سیاست دانوں کی ہر وقت کی آمد سے دوسرے مریضوں کے عزیز رشتہ داروں سے ملنے پر پابندی عائد ہوگئی۔ شاد صاحب بہت بے چین تھے۔

اسٹاف کی توجہ بھی دوسرے مریضوں پر سے کم ہوگئی۔

غفلت کی وجہ سے شاد صاحب انفیکشن کا شکار ہو گئے۔ ایک مرتبہ پھر زندگی کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

یہ خبر بھی عام ہوگئی۔ ہر لب پر دعائیں اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہر مذہب و ملّت کے لوگ دعا گو تھے۔ آئی۔ سی۔ یو میں دونوں کے بیڈ قریب......زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا......منسٹر صاحب کے نزدیک ہر وقت اسٹاف موجود رہتا، لیکن ساری محنت رائیگاں گئی..........منسٹر صاحب اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

شاد صاحب کے عزیز واحباب کے دل سے نکلی دعائیں رنگ لائیں۔ موت کے آہنی پنجوں سے آزاد کرالائیں۔

دونوں کے چاہنے والوں کا مجمع باہر لگا تھا۔ ان کے چاہنے والوں کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔

اخبارات میں منسٹر صاحب کی جھوٹی تعریفوں اور کارگردگی سے صفحے کالے ہو رہے تھے۔ اور ایک کونے میں مختصر سی خبر..........

"ساہتیہ اکادمی اوارڈ یافتہ شاد صاحب صحتیاب ہو گئے۔"

Dr.Farkhanda Zameer
Associate Professor
Arbab Mantion
H.No 805/13, Azad Nagar
Khanpura
Ajmer- 305002 (Rajasthan)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language مسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

فرحہ جبیں

کہاں ہو تم

پیارے دوست تابش!

سلام!

امید ہے تم خیریت سے ہوں گے۔تم نے اپنی آخری ملاقات پر مجھ سے کہا تھا کہ میں پہلے کی طرح افسانے لکھوں۔اس وقت تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن بعد میں جب تمھاری یاد آتی تو افسانہ لکھنے کا خیال بھی آتا۔ ایک تم ہی تو ہو جو مجھ سے ملنے آتے ہو ورنہ کون ہے جو مجھ سے ملنے آئے۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ تمھاری بھابھی بہت سال پہلے ہی مجھے چھوڑ چکی۔ بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر میں نے ہی انھیں دوسرے شہر بھیج کر ان کے انتظار کو اپنا مقدر بنا لیا اور جانتے ہو جب وہ واپس آ کر اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہوئے تو انھوں نے ہی مجھے میرے ہم عمروں کے پاس بھیج دیا لیکن کچھ دنوں بعد میں وہاں سے یہاں آ گیا جہاں صرف تم مجھ سے ملنے آتے ہو۔اس لیے صرف تمھاری خواہش کے احترام میں ہی میں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے ہیں۔یہ افسانہ بھی صرف تمھارے لیے لکھا ہے۔مجھے امید ہے کہ تمھیں پسند آئے گا۔

موسم خزاں میں مہرین بالکنی میں کھڑی تھی۔پاس رکھی میز پر اس کی چائے تو نہ جانے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن وہ تو صرف سامنے دیکھ رہی تھی جہاں دور دور تک لمبے لمبے درخت اور زمین زرد پتوں سے اٹی پڑی تھی۔تیز ہوائیں پتوں کو درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں سے اڑا کر لے جا رہی تھی اور درختوں کی طرح وہ بھی اپنے اندر ایک خالی پن محسوس کر رہی تھی۔سب کچھ بے کیف اور بے رنگ سا تھا۔اب اکثر اس کی یہی کیفیت رہنے لگی تھی۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔اس کا ذہن ماضی کی طرف چلا گیا کہ جب وہ سات سال کی تھی اس کے والدین سڑک حادثے میں انتقال کر گئے۔اسے اس کی جوان بیوہ خالہ جو کہ کینسر کی مریضہ تھیں انھوں نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا لیکن ان کا زیادہ وقت اسپتال کے چکر لگانے میں کٹتا تھا۔انھیں اپنی زندگی سے زیادہ امیدیں نہیں تھی اس لیے بی۔اے کے بعد ہی اس کی شادی کر دی اور کچھ دنوں بعد وہ دنیا سے چلی گئیں۔اسلم محکمہ جنگلات میں افسر تھے۔انھیں سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا جو کہ کشادہ اور دو فرد کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ان کے کوارٹر کے پیچھے صرف ایک ہی کوارٹر تھا جس میں انور صاحب ان کی بیوی اور بیٹا ریحان رہتے تھے، باقی کوارٹرز کچھ دوری پر تھے۔

ریحان پانچ سالہ بہت پیارا بچہ تھا۔وہ اکثر مہرین کے پاس آ جاتا۔وہ ریحان کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی لیکن کچھ دن پہلے انور صاحب کا تبادلہ دوسری جگہ ہو گیا۔ریحان کے جانے سے وہ بہت بے چین اور اداس رہنے لگی تھی۔اسی دوران اسلم کو ایک مہینے کے لیے دوسرے شہر جانے کا آرڈر آ گیا اور وہ چلے گئے۔اسلم کو گئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔اس کے دن بہت ویران گزر رہے تھے۔آج اسے ریحان کی یاد شدت سے آ رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' اس نے پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔دوبارہ

دستک ہوئی تو اس نے دروازہ کھولا سامنے ریحان کھڑا تھا۔ اس نے بے ساختہ اسے گلے لگا لیا اور اسے پا کر خوشی سے جھوم اٹھی۔ ریحان نے بتایا کہ وہ لوگ واپس آ گئے ہیں۔ اس نے فون پر اسلم کو بھی یہ خبر دی کہ انور صاحب کی فیملی واپس آ گئی ہے۔ اسلم حیران تو ہوا لیکن پھر نظر انداز کر کے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

''مہرین ایک بار پھر خوش رہنے لگی تھی۔ اسلم سے جب بھی فون پر بات کرتی تو ریحان اور اپنے قصے سناتی۔آج اسلم کو گھر آنا تھا۔وہ ریحان کے لیے بھی بہت سارے کھلونے اور چا کلیٹس لے کر آیا تھا۔جب وہ گھر پہنچاتو مہرین پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور افسردہ سی نظر آئی۔ شام میں وہ انور صاحب اور ریحان سے ملنے ان کے کوارٹر پر گیا لیکن یہ کیا وہاں تو تالا لگا ہوا تھا اور مکڑیوں نے جالے بنا رکھے تھے۔ وہ چونک گیا۔کل تک تو مہرین ریحان کا ذکر کر رہی تھی کہ ریحان اس کے ساتھ ہے۔''

مہرین ایک بار پھر خوش رہنے لگی تھی۔ اسلم سے جب بھی فون پر بات کرتی تو ریحان اور اپنے قصے سناتی۔ آج اسلم کو گھر آنا تھا۔ وہ ریحان کے لیے بھی بہت سارے کھلونے اور چاکلیٹس لے کر آیا تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو مہرین پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور افسردہ سی نظر آئی۔ شام میں وہ انور صاحب اور ریحان سے ملنے ان کے کوارٹر پر گیا لیکن یہ کیا وہاں تو تالا لگا ہوا تھا اور مکڑیوں نے جالے بنا رکھے تھے۔ وہ چونک گیا۔ کل تک تو مہرین ریحان کا ذکر کر رہی تھی کہ ریحان اس کے ساتھ ہے۔ اسلم اپنے کوارٹر پر آیا، اندر سے مہرین کے بولنے اور ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ مہرین نے جیسے ہی دروازہ کھولا اسلم نے پوچھا۔

''کس سے بات کر رہی تھیں؟''

''ریحان سے'' مہرین نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ریحان کہاں ہے؟'' اسلم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ بیٹھا تو ہے۔'' مہرین نے اسے گھور کر دیکھا۔

''مہرین مذاق مت کرو۔ ریحان کہاں ہے؟ کیا وہ اپنی فیملی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے کوارٹر پر تالا کیوں لگا ہے؟'' اسلم کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

مہرین بھی سنجیدہ ہو گئی۔ ''اس کے گھر پر تالا کیوں لگا ہے۔ ریحان تو یہیں ہے۔'' وہ بدبدائی۔.................. کچھ مہینوں سے............ مہرین ایک اسپتال میں ہے۔ جہاں اس کا علاج چل رہا ہے۔ وہ اسلم کو بہت یاد کرتی ہے پہلے تو وہ اس سے ملنے بھی آ جاتا تا لیکن دوسری شادی کے بعد اس کا آنا بہت کم ہو چکا ہے۔ وہ اسلم کے انتظار میں دروازے کے پاس گھنٹوں کھڑی رہتی ہے۔ اب وہ کسی سے بات نہیں کرتی سوائے ریحان کے جو ابھی بھی اس سے ملنے آتا رہتا ہے۔

افسانہ لکھتے ہوئے بھی تمھاری یاد بہت شدت سے آ رہی تھی۔ تابش میں تم سے بہت زیادہ بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرے ارد گرد بہت سے مریض ہیں میری بائیں جانب کے بیڈ پر شائزوفرینیا کا مریض ہے اور سامنے والے بیڈ پر بائی پولر ڈس آرڈر کا مریض جس کو......خیر چھوڑو۔ بہت سے ایسے مریض ہیں لیکن............اچھا سنو! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں جلد ہی یہاں سے جا سکتا ہوں۔ یہاں نرس میرا بہت خیال رکھتی ہے اور ایک نئی نرس بھی آئی ہے۔ میں اب لکھنا بند کر رہا ہوں وہ دونوں آ رہی ہیں۔ میری دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔ میں یہ خط نرس کو دے دوں گا وہ تم تک پہنچا دے گی۔

پرانی نرس نے اس سے خط لے کر نئی نرس کو دے دیا اور اسے دوا کھلانے لگی۔ روم سے نکلنے کے بعد نئی نرس نے پوچھا۔

''یہ خط کہاں بھیجنا ہے؟''

''کہیں نہیں......'' پرانی نرس نے عام سے انداز میں جواب دیا۔

''لیکن یہ تو کسی دوست کے نام لکھا ہے۔'' نئی نرس نے حیرانی سے پوچھا۔ پرانی نے گہری سانس لی اور جواب دیا۔

''ایسا کوئی دوست ہے ہی نہیں۔''

□□□

Farha Jabi
Research Scholar
Maulana Azad National Urdu University
Lucknow Campus
Lucknow-226020 (U.P)
Mobile. 7234011848

محمودہ قریشی

اردو ہے میرا موبائل

''اردو ہے میرا نام ،ہمیں جانتے ہیں داغ۔'' اردو ہم نے پڑھی ہے اور بہت شیرینی زبان ہے۔ اردو کی ایک ادنیٰ سی طالب علم ہیں تو ظاہر ہے اردو پڑھنا لازمی بھی ہے۔ اب چونکہ لکھنے لکھانے کا شوق بھی پیدا ہو گیا ہے تو اردو زبان ہی اوڑھنا بچھونا بن گیا ہے۔ نصاب کی کتابوں کے علاوہ دیگر اردو کی کتابیں، اردو رسائل، اردو اخبارات یہاں تک کہ موبائل کی زبان اور اس میں موجود سبھی ایپز کی زبان بھی اردو ہی ہے۔ انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی نے جب اردو زبان کا آپشن دے ہی رکھا ہے تو کیوں ہم کسی اور زبان کا استعمال کر خود کو غیر اردو داں طبقے میں شامل کریں۔ اردو ہماری مادری زبان بھی ہے۔ جو بات ہم اردو کے ذریعے دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں وہ کسی اور زبان کے ذریعے نہیں۔ یہ اردو سے ہماری محبت کا ثبوت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اردو ادب سے وابستہ افراد سے ملنا، باتیں کرنا اور اردو ادب کی محفلوں میں جانا تو سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ چونکہ شعر و شاعری سے سبھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ غیر اردو داں طبقے کی محفلوں اور شادی بیاہ کی رسومات میں شرکت سے تو ہم گریز کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن بات جب خاص اپنوں کی ہو جیسے کزن وغیرہ کی شادی ہو تو نہ جانے کا سبب تلاش کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اور خود سے نہ چاہتے ہوئے بھی شرکت کرنی ہی پڑتی ہے۔

اسے آپ اپنوں کا دل رکھنے کی مجبوری ہی کہہ لیجیے ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی والدہ کے اسرار پر خاص خالہ زاد بہن کی شادی میں شرکت کرنی پڑی، وہاں ہمارا کیوں کر دل لگنے والا تھا۔ ہاں دلہن تو اردو ادب سے ہی تھی لیکن دولہا میاں سائنس سے اب اس بے چاری کو کیوں کر فرصت ملنے والی تھی کہ وہ ہم سے بیٹھ کر باتیں کرے۔ یہ تو آپ اچھے سے سمجھ گئے ہوں گے اب حالت تو غالب کے شعر جیسی ہی تھی کہ

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائی تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا، شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

رخصتی سے پہلے امی اور گھر کے افراد کیوں کر وہاں سے ٹلنے والے تھے۔ ہمارے جذبات تو ردیف اور قافیہ میں ہی الجھ کر رہ گئے ,ماحول کی تبدیلی کی وجہ سے جذبات بالکل مجروح ہو گئے تھے۔ حالت ایسی تھی کہ بس ذہن میں فیض احمد فیض کا شعر ہی رقص کر رہا تھا کہ:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

شادی جیسے ماحول میں جب کہ سبھی خواتین ہنسی مذاق میں مصروف تھی اور بات بے بات ہنسی کے ٹھیکے پھوٹ رہے تھے۔ اس وقت

اس شکستہ دل کو بہلانے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا ہمارا اردو موبائل چونکہ:
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

"اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے اگر تھوڑی دیر اور یہاں رکے تو ہمارے کانوں کی سننے کی قوت ہی جواب دے جائے گی جس طرح ڈھول پیٹنے والے ڈھول بجا رہے تھے۔معلوم نہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ شادیوں میں ڈھول کیوں بجائے جاتے ہیں۔ایک تو آپ لوگ دلہن جیت لے جاتے ہیں۔ پھر اس کا جشن بھی ظاہر کرتے ہیں۔ دلہن کی ماں کو تو یہ لوگ پوری طرح سے خالی کر دیتے ہیں۔ بچپن سے بیٹی کے بیاہ کے لیے جو جوڑ جوڑ کر رکھا تھا وہ تو جاتا ہی ہے ساتھ میں اس ماں کا جگر کا ٹکڑا اس کی بیٹی بھی چلی جاتی ہے"

اور صحیح بات ہے انسان کے پاس آج کے وقت میں دل بہلانے کا ایک ہی تو ذریعہ ہے جس کو وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے۔ ہم بھی تہذیب ہافی صاحب کی غزلوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔اب ہمت تو جواب دے گی ہی منہ کی ذائقہ کلیاں جو اتاولی ہو رہی تھی کہ جلد از جلد ان کو خاموش کیا جائے بس کیا تھا چاٹ پکوڑے سے ان کو خاموش کرنے کی مہم میں ہم بھی ساتھ ہو لیے اور پانی پوری کے اسٹال پر جی خوش ہو گیا چونکہ اتنا تیکھا پانی کہ مزا آ گیا۔تب ہی ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہماری ماموزاد بہن ہمیں کھینچتی ہوئی باہر لے گئی کہ بارات آ گئی...... بارات آ گئی... ہم اس کے ساتھ دروازے تک چلے گئے جہاں باراتی اتنے مست ہو کر ناچ رہے تھے کہ ان کو خود اپنا ہوش ہی نہیں تھا دولہا میاں بھی گھوڑے سے ہی اچک اچک کر سارے نظارے کا لطف اٹھا رہے تھے یا ان کی نظریں ہم سب لڑکیوں میں اپنی دلہن تلاش کر رہی تھی۔سب ایک دوسرے کو ٹھوکے دے رہے تھے تو ہماری نظریں ان خواتین کے نیم عریاں بدن کا جائزہ لینے میں مصروف تھی جو کہ دسمبر کی ٹھنڈ میں بھی اپنے بدن کی نمائش کرنے میں کیوں کر مجبور ں تھی؟ لیکن اس میں ان بے چاری معصوم بچیوں کا کیا قصور چونکہ اکبر الہ آبادی نے سچ ہی تو کہا ہے:

بے پردہ نظر آئی جب چند بیویاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگی کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

لاحول ولاقوۃ الہ بلیہ علیل عظیم ہم بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔

اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے اگر تھوڑی دیر اور یہاں رکے تو ہمارے کانوں کی سننے کی قوت ہی جواب دے جائے گی جس طرح ڈھول پیٹنے والے ڈھول بجا رہے تھے۔معلوم نہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ شادیوں میں ڈھول کیوں بجائے جاتے ہیں۔ایک تو آپ لوگ دلہن جیت لے جاتے ہیں۔ پھر اس کا جشن بھی ظاہر کرتے ہیں۔ دلہن کی ماں کو تو یہ لوگ پوری طرح سے خالی کر دیتے ہیں۔ بچپن سے بیٹی کے بیاہ کے لیے جو جوڑ جوڑ کر رکھا تھا وہ تو جاتا ہی ہے ساتھ میں اس ماں کا جگر کا ٹکڑا اس کی بیٹی بھی چلی جاتی ہے۔ یہ تو امیر خسرو کی پہیلی کی طرح ہوا۔

کھیر پکائی جتن سے چرکھا دیا چلا
آیا کتا کھا گیا،تو بیٹھی ڈھول بجا

ارے یہ تو دنیا کا دستور ہے بیٹیوں کو تو جانا ہی پڑتا ہے۔کوئی بھی کیوں کر بیٹیوں کو بیٹھا کر رکھ سکتا ہے۔ راجہ مہاراجہ تک سے اپنی بیٹیاں نہ بیٹھائی گئی تو عام انسان اس بوجھ کو کیوں کر برداشت کر سکتا ہے۔ بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں کیا۔ارے نہیں یہ تو قدرت کا انمول خزانہ ہوتیں ہیں۔ ہم بھی کیا باتیں لے کر پھر بیٹھ گئے خیر جانے دو۔ جس کو حل کر نہ سکے حکیموں کے کرامات۔

اب آرام سے کرسی پر بیٹھ کر اپنے پرس سے موبائل نکال کر غزلوں سے مستفید ہوا جائے-پرس سے موبائل نکالنے کے لیے پرس میں ہاتھ ڈالا تو پرس میں موبائل ہی نہیں تھا۔ارے ہمارا موبائل کہاں گیا۔ ہم نے تو پرس میں ہی رکھا تھا-پورا پرس دیکھ لیا لیکن نہیں ملا موبائل؟ ارے جب بارات دیکھ رہے تھے کہی وہاں،تو نہیں گر گیا چلو چل کر دیکھا جائے لیکن وہاں تو کہی نہیں تھا اور اگر گرا بھی ہوگا تو نہ جانے کس کس کے قدموں سے کچل گیا ہوگا۔ جس کے پرزے پرزے ہو چکے ہوں گے۔یعنی ہمارا موبائل ٹوٹ پھوٹ کر چکنا چور ہو گیا ہوگا؟ ابھی تو تمھارے پاس ہی تھا ماموزاد بہن نے چٹکی لی۔"جب تم گول گپے کھا رہی تھی تمھارے ہاتھ ہی میں ہی تو دیکھا تھا؟" شاید وہی کہی چھوٹ گیا ہوگا-وہاں جا کر تلاش کرو-گول

گپے والے انکل سے پوچھا:

''انکل آپ نے کوئی موبائل دیکھا ہے؟'' لیکن انھوں نے ایک دم سپاٹ لہجہ میں کہا کہ نہیں نہیں یہاں کوئی موبائل نہیں گرا ہے۔ نہ ہی ہم نے دیکھا ہے ہم تو یہاں پانی پوری کھلانے میں مگن ہیں۔ بیٹا آپ کو خود سے دیکھنا چاہیے تھا۔

ارے میرا موبائل کہا جاسکتا ہے؟ کزن نے کہا چلو کوئی بات نہیں شادی بیاہ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ نیا خرید لینا

''"میرا موبائل اردو تھا۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

اور پوری محفل میں یہ بات پھیل گئی کہ ہمارا موبائل کھو گیا ہے۔ دلہن نے کہا میں تمھیں نیا موبائل لے کر گفٹ کر دوں گی لیکن ابھی تم اپنا موڈ خراب نہیں کروں کزنس نے دولہے کے جوتے چرائے جانے کا اصرار کیا۔

''چلو دولہے میاں کے جوتے چرانے چلتے ہیں۔ لیکن اب ہمارا وہاں کیوں کر دل لگنے والا تھا۔

امی نے بھی ہمیں پریشان دیکھ کر بھائی کے ساتھ گھر بھیج دیا کہ تم دونوں جاؤ میں تمھارے ماموں کے ساتھ آجاؤں گی۔

دوسرے دن امی بھی آگئیں اور مجھے اداس دیکھ کر کہنے لگیں ''کل ہم تمھارا موبائل لینے چلیں گے ابھی تم سو جاؤ لیکن امی میرا موبائل اردو تھا؟ اس میں میرے بہت سارے نوٹس، اردو پی-ڈی-ایف-کتابیں-تھی وہ تو نہیں آپائیں گی نا مجھے اپنا ہی موبائل چاہیے اس میں میرا بہت کچھ تھا۔''

بھائی نے کہا سب واپس آجائے گی تم نئے موبائل کو اپنی اسی آئی-ڈی سے لاگ ان کر لینا۔

موبائل چرانے والا بھی تو کہہ رہا ہوگا کس کمبخت کا موبائل چوری کیا ہے جس میں کچھ بھی نہیں چل پا رہا ہے- بھائی نے میری ٹانگ کھینچتے ہوئے کہا۔

صبح اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر ہم لوگ شاہ مارکیٹ جا کر نیا موبائل خرید لائے میں نے اپنے نئے موبائل کی ساری سیٹینگ پھر سے اردو میں کر لی اور نیا موبائل بہت اچھا تھا- لیکن ہمارے ذہن میں ابھی بھی اسی پرانے موبائل کی یادیں بسی ہوئی تھی وہ کہتے ہیں نا اولڈ از گولڈ- دو ایک روز ایسا ہی رہا لیکن جلد نئے موبائل کی ہی عادت پڑ گئی۔

ایک دن ہم صبح صبح اپنے سٹیٹس چیک کر رہے تھے کہ اسکرین پر خالہ زاد بہن کا نمبر شو ہونے لگا- او کے کر کے فون ریسیو کیا دوسری طرف سے ہیلو کے بعد ایک زوردار قہقہے کے ساتھ کزن نے کہا۔

''تمھارے لیے ایک خوش خبری ہے؟ خوش خبری ہم نے کہا؟

''میں نے خالہ سے سوالیہ نظروں سے کہا خالہ کہاں ہے وہ گول گپے ولے انکل ہمیں ان کا شکریہ کہنا ہے اتنے میں ساد بھائی بھی آگئے انہوں نے مجھے ہدایت کی تم کیا کروگی ہم نے تمہاری طرف سے شکریہ پہلے ہی بول دیا ہے -لیکن ہم نے بھی ضد کر لی کہ ہمیں ان سے ملنا ہی ہے تو ساد بھائی نے فون کر کے گول گپے والے انکل کو ان کا پیمنٹ دینے کے بہانے گھر پر ہی بلا لیا .پہلے تو میں نے نیچے سے اوپر تک ان کا جائزہ لیا پھر طپاک سے بول دیا انکل آپ کا , بہت بہت شکریہ آپ کی وجہ سے ہمارا موبائل واپس مل گیا ویسے انکل آپ کو یہ کہاں ملا؟''

ہاں ہم نے سنا ہے کہ شادی کے بعد خوش خبری ہوتی ہے لیکن اتنی جلدی کچھ سمجھ نہیں آیا ہم نے سوال کیا

دھت تیرے کی...... کزن نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اور خوش خبری یہ ہے کہ تیرا اردو موبائل مل گیا ہے؟

اچھا... کیسے اور کہا ملا ہم نے ایک دم حیرت سے پوچھتے ہوئے کہا

اس نے جلدی جلدی ایک ہی سانس میں کہنا شروع کیا:

تم نے جہاں گول گپے کھائے تھے نا وہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ گول گپے والے انکل ایماندار نکلے جوان کو مل گیا اب وہی گھر دے گئے ہیں-تم وہاں سے منگا لینا میں دہلی میں ہوں اپنی سسرال میں اچھا میں رکھتی ہوں کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

موبائل ملنے کی اتنی خوشی تھی کہ پورے گھر میں چلا چلا کر کہنے لگے ہمارا موبائل مل گیا...... ہمارا موبائل مل گیا. ... اور امی کو ہدایت کی کہ امی اسے جلد از جلد منگا لیجیے آپ پلیز بھائی کو بھیج کر ہمارا موبائل منگا لیجیے امی

نے کہا بھی جب کبھی جانا ہوگا تب لے لیں گے ویسے بھی تمھارے پاس نیا فون تو ہے ہی نہ امی نے ایک دم سے طنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن ہم نے بھی ضد کرلی کہ ہمیں ابھی چاہیے؟

امی نے کہا ٹھیک ہے کل چلتے ہیں اور آپ چلیے گا۔

پوری رات ذہن میں عجیب سے سوالات رقص کرنے لگے کہ جب ہم نے ان گول گپے والے انکل سے کہا تھا تو وہ کیوں مکر گئے تھے؟ یا ان کو موبائل بعد میں ملا تھا؟

اور اگر بعد میں ملا تھا تو جاتے وقت کسی کو بھی دے جاتے؟ وہ اپنے گھر کیوں لے کر گئے- کیا ان کا موبائل پر ایمان خراب ہو گیا تھا؟

جب ان کا ایمان خراب ہو ہی گیا تھا تو کیوں اب واپس دینے کے لیے آئے؟ دل نے کہا کہ:

ان سارے سوالات کے جواب تو اب وہی بتا سکتے ہیں۔

ابھی سو جانا چاہیے صبح جلدی اٹھنا ہے۔ ذہن نے حکم دیا۔

صبح جلدی جلدی اٹھ کر ہم لوگ خالہ کے یہاں پہنچ گئے اور جاتے ہی خالہ نے ہمارا موبائل ہمیں دے دیا۔

"یہ لو تمھارا موبائل۔"

آج کل کے بچے بھی موبائل کو تو اپنی جان سمجھتے ہیں خود کو کچھ ہو جائے لیکن موبائل کو کچھ نہیں ہونا چاہیے خالہ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور امی نے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے 'ہوں' کہہ دیا۔

میں نے خالہ سے سوالیہ نظروں سے کہا خالہ کہاں ہے وہ گول گپے والے انکل ہمیں ان کا شکریہ کہنا ہے اتنے میں ساد بھائی بھی آگئے انھوں نے مجھے ہدایت کی تم کیا کروگی ہم نے تمھاری طرف سے شکریہ پہلے ہی بول دیا ہے-لیکن ہم نے بھی ضد کرلی کہ ہمیں ان سے ملنا ہی ہے تو ساد بھائی نے فون کرکے گول گپے والے انکل کو ان کا پیمنٹ دینے کے بہانے گھر پر ہی بلا لیا۔ پہلے تو میں نے نیچے سے اوپر تک ان کا جائزہ لیا پھر طپاک سے بول دیا انکل آپ کا, بہت بہت شکریہ آپ کی وجہ سے ہمارا موبائل واپس مل گیا ویسے انکل آپ کو یہ کہاں ملا؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

انھوں نے شرماتے ہوئے کہا بیٹیا تمھارا موبائل کھویا نہیں تھا بلکہ ہم نے ہی رکھ لیا تھا۔

یاد ہے تم گول گپے کھا رہی تھی تو وہیں پر تم نے اپنا موبائل رکھ دیا تھا لیکن جب تم گئی تو موبائل اٹھانا بھول گئی تھی تو میں نے سوچا کیوں نہ اسے خود ہی رکھ لیا جائے۔ انھوں نے گردن جھکاتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

"لیکن انکل جب آپ نے موبائل رکھ ہی لیا تھا تو کیا ضرورت تھی تمھیں واپس کرنے کی اور کسی کو کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔" میں نے سوال کیا۔

ہاں بیٹیا کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا، لیکن میں نے جب اپنی سم ڈال کر موبائل آن کیا تو کچھ عجیب سے الفاظ آرہے تھے۔

"بیٹا میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں لیکن موبائل میں بول بول کر سب کام کر لیتا ہوں میں نے جب اس میں بولا تو وہی عجیب سے شبد دکھائی دے رہے تھے۔میرا سر چکرا گیا اور میں نے موبائل رکھ دیا کچھ دن کوشش کرنے کے بعد جب کچھ بھی نہیں کر سکا تو میرا دھرم جاگ گیا کہ شاید بھگوان نے . یہ مجھے مو بائل چرانے کا دنڈ دیا ہے۔ انھوں نادم ہوتے ہوئے کہا۔"

بیٹا میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں لیکن موبائل میں بول بول کر سب کام کرلیتا ہوں میں نے جب اس میں بولا تو وہی عجیب سے شبد دکھائی دے رہے تھے۔ میرا سر چکرا گیا اور میں نے موبائل رکھ دیا کچھ دن کوشش کرنے کے بعد جب کچھ بھی نہیں کر سکا تو میرا دھرم جاگ گیا کہ شاید بھگوان نے۔ یہ مجھے موبائل چرانے کا دنڈ دیا ہے۔ انھوں نادم ہوتے ہوئے کہا۔

اس لیے یہ بیٹا...

اچھا اچھا تو آپ کو میری اردو ایپ کی وجہ سے دقت پیش آئی میرا تو پورا موبائل ہی اردو ہے۔

اور آج اردو کی وجہ سے ہی میرا موبائل مل پایا ہے یعنی کہ میرا موبائل اردو ہے کہتے ہوئے میں بھیا کے گلے سے جھول گئی اردو نے مجھے میرا موبائل واپس دلا دیا تھا۔

□□□

Mehmooda Qureshi
22/78 Dholi Khar Mantola
Agra Fort
Agra-282003 (U.P)
Mob: 7417912943

ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی

بثور لبنیہ (مہاسے)
Acne Vulgaris

بثور لبنیہ کو عام زبان میں مہاسے یا Pimples بھی کہتے ہیں، یہ عام جلدی مرض ہے، جس میں غدد دہنیہ (Sebaceous glands) کے کثرت افراز کی وجہ سے کیسہ شعریہ میں دہنی مادوں کا اجتماع ہو جاتا ہے جو جلد کی سطح پر بثور (دانوں) کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ دانے عام طور پر جوانی میں چہرہ، گردن، شانے اور پشت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ دانے کولہوں پر بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اس مرض کی شروعات 13-16 سال کی عمر میں ہوتی ہے اور 70% فیصد لوگوں میں یہ مرض 25-30 سال تک کی عمر میں زائل ہو جاتا ہے۔

اسباب

☆ ہارمون کا عدم توازن: بلوغت کے دنوں میں جنسی ہارمون مثلاً Male Androgen اور Progesteron کی زیادتی اور ان کا عدم توازن اس کا سبب ہوتا ہے۔

☆ گرمی کے دنوں میں، گرم مقامات پر سورج کی شعاعوں کے اتصال اور حساسیت جلد کی وجہ سے اکثر غدد دہنیہ کا افراز بڑھ جاتا ہے۔

☆ بعض اوقات غدد دہنیہ کی حساسیت بڑھ جانے کی وجہ سے بھی غدد دہنیہ سے روغنی مادوں کا افراز بڑھ جاتا ہے۔

☆ Acne propionibacterium نامی جرثومہ جو کہ جلد کے مسامات میں موجود ہوتے ہیں، غدد دہنیہ کے کثرت افراز کی وجہ سے فعال ہو جاتے ہیں۔

☆ میٹھی اور روغنی اشیاء کا کثرت استعمال

☆ جسم میں وٹامن اے اور وٹامن سی کی کمی

☆ طبعی طور پر جلد کا روغنی ہونا

☆ ایام حمل میں بثور لبنیہ ہو سکتے ہیں

☆ گرم غذاؤں کا زیادہ استعمال کرنے سے بھی مہاسے ہو سکتے ہیں۔

علامات

بثور لبنیہ میں جلد سے روغنی مادوں کا افراز بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے مقامی طور پر جلد چکنی ہو جاتی ہے۔ اس مرض کی مخصوص علامات اس کے سیاہ و سفید بثور (دانے) ہیں جو مرض کے درجات کے حساب سے مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ عام طور پر اس مرض میں دانے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ گردن، بازو، پشت اور کولہوں پر بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔

درجات مرض

1White headed Comedones کا درجہ: یہ مہاسے کا پہلا درجہ ہوتا ہے، اس میں شروعات میں جلد پر چھوٹے چھوٹے ابھار یا سفید دانے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان ابھاروں کا اوپری حصہ دودھ کے رنگ کا ہوتا ہے، اس لیے انھیں بثور لبنیہ کہا جاتا ہے۔

2۔Black headed Comedones کا درجہ: کچھ وقت گزرنے کے بعد سفید دانوں کے سرے کھل جاتے ہیں جن میں گرد وغبار جمع ہوجاتے ہیں ان میں کیمیاوی تکسیدی عمل انجام پانے کی وجہ سے وہاں پر موجود tyrosin میلانن میں تبدیل ہوکر رطوبت کو سیاہ کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے دانے سیاہ رنگ کے دکھتے ہیں۔ مہاسے کے 50 فیصد معاملات دوسرے درجہ تک ہی محدود ہوتے ہیں اور علاج سے ٹھیک ہوجاتے ہیں۔

3۔Acne Papilosa کا درجہ: اس درجہ میں Propioniacterium نامی جرثومہ کے فعال ہونے کی وجہ سے التہابی کیفیت ہوجاتی ہے جس کے سبب دانے سرخ ہوجاتے ہیں اور دانوں میں درد اور چبھن کا احساس ہوتا ہے۔

4۔Acne Pustulosa کا درجہ: اس درجہ میں ثانوی تعدیہ کی وجہ سے دانوں میں پیپ (Pus) بھر جاتا ہے۔ اس میں لاحق ہونے والے تعدیہ کا سبب Staphylococci نامی بیکٹیریا ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ بثور لبنیہ کا آخری درجہ ہوتا ہے لیکن کچھ افراد میں اس کے اور درجات بھی ظاہر ہوسکتے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں۔

5۔Acne indurata کا درجہ: اس درجہ میں بثور کی رطوبت اور پیپ کے مادے تو خشک ہوجاتے ہیں لیکن ان کی جسامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ سخت ہو کر Nodule کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

6۔Acne cystica کا درجہ: یہ درجہ Acne indurata کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس درجہ میں Nodules تحلیل ہوکر Pseudocyst بنا لیتے ہیں۔

اصول علاج

- ☆ سبب کا ازالہ کریں
- ☆ مصفی دم معدل دوائیں استعمال کرائیں
- ☆ مرض کے درجہ سوم میں محللات کا استعمال کرائیں
- ☆ مرض کے درجہ چہارم میں ضد حیوی (Antibiotic) کا استعمال کرائیں
- ☆ جالی، قاطع، محلل اور دافع تعفن دواؤں کا مقامی استعمال کرائیں۔
- ☆ میٹھی اور روغنی اشیاء کے زیادہ استعمال سے پرہیز کرایا جائے۔
- ☆ نقص تغذیہ کو دور کیا جائے اور خاص طور سے ایسی دوائیں استعمال کرائیں جن میں وٹامن اے اور سی شامل ہوں۔

☆ قبض کو رفع کریں

علاج:

☆ شاہترہ، چرائتہ، گل منڈی، صندل، سرپھوکہ، گل نیم، سبھی دوائیں 5 گرام بطور جوشاندہ ہمراہ شربت نیلوفر 2 چمچ صبح وشام استعمال کرائیں۔

☆ مرکب یونانی ادویہ میں معجون عشبہ، شربت عناب، اطریفل شاہترہ، معجون عشبہ، شربت مصفی، قرص اصفر، حب مصفی خون وغیرہ استعمال کرائیں۔

☆ قبض کی صورت میں قرص ملین، حب مقل، خمیرہ بنفشہ وغیرہ استعمال کرائیں۔

مقامی طور پر علاج

☆ آرد ترمس، تخم باقلا، تخم خشخاش، تخم خربزہ، مغز بادام، زعفران، سرسوں حسب ضرورت شامل کر کے بطور ابٹن استعمال کرائیں۔

☆ کف دریا تنہا یا ہلدی کے ساتھ گھس کر لگائیں

☆ سرکہ کے ساتھ کلونجی لگائیں

☆ برگ نیم، بیخ سوسن، پوست سرس ایک ساتھ ملا کر طلا کریں۔

☆ السی کو کچل کر اس میں پسی ہوئی کلونجی ملالیں اور پھر اس میں سرکہ اور عرق گلاب شامل کر کے لگائیں۔

☆ کافور، زعفران، اور گل ارمنی کو دودھ یا عرق گلاب میں ملا کر لگائیں۔

☆ اگر بالوں میں Dandruff ہو تو سر میں ہلکے تیل (Light oils) کا استعمال کرائیں۔

☆ چہرے کو کم از کم دن میں دو بار ہلکے گرم پانی سے دھویا جائے۔

☆ روغن آمیز مرکبات کے مقامی استعمال سے پرہیز کرایا جائے۔

طب جدید میں علاج

☆ داخلی طور پر ضد جیوی (Antibiotics) کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً Azithromycin اور Doxycycline وغیرہ

☆ خارجی طور پر دافع تعفن، محلل اور اسٹیرائیڈ سے بنی ہوئی کریم یا لوشن استعمال کرائیں۔ جیسے Clindamycin, Nictotinamide وغیرہ

☆ ہارمون کی بے اعتدالی کو دور کرنے کے لیے عورتوں میں اسٹروجن کے مرکبات اور مردوں میں Antiandrogens مثلاً cyproterone acetate کا استعمال کیا جاتا ہے۔

□□□

Dr. Mohd Safwan Kidwai
Village Turkani
Post Safdarganj,
District Barabanki-225412 (Uttar Pradesh)

مکتوب نگاری کا فن اور روایت ، بند دریچے کی شاعرہ: سائرہ عظیم، ظفر اقبال اہل فن کی نظر میں، اردو تحقیق کی روایت، خواتین ناول نگار: ایک جائزہ وغیرہ قابل ذکر مضامین ہیں۔
شاعرات کے منتخب اشعار میں خورشید بانو شمع، عرفانہ عزیز، فہمیدہ ریاض کے اشعار دل کو بہت بھائے۔

میرے باطن میں جو انسان ہے پہچان اسے
میرے چہرے پہ مرے ذہن کی تصویر نہیں

لمحات مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

مذکورہ اشعار میں خواتین کے جذبات و احساسات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔
اس شمارے کے افسانے بھی قابل ذکر ہیں۔ 'آخر کیوں' اور 'محبت کا قرض' دونوں افسانے بہت اچھے لگے۔ صحت کے متعلق مضمون بھی قابل ذکر ہے۔ شمیمہ صدیقی شمی کا افسانہ 'نیند کی گولیاں' بھی بہت اہم اور قابل ذکر افسانہ ہے۔ شہناز رحمت کی دونوں غزلیں بہت پسند آئیں۔ ذاکرہ شبنم کی نظم 'تاج محل کو دیکھ کر' بھی بہت اچھی لگی۔
'تھائرائیڈ اور خواتین' مضمون صحت کے متعلق لائق توجہ اور قابل ذکر ہے۔ تحقیق کے دوران پتہ چلا ہے کہ اگر تھائیرائیڈ کا بر وقت پتہ چل جائے تو اس کا علاج ممکن ہے۔ بعض وقت لاپرواہی کے سبب بہت سے خطرات اس بیماری سے خواتین کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ تھائرائیڈ کینسر کی وجہ سے گلے میں گانٹھ، تنگی نفس، نگلنے میں دشواری یہ تمام تکالیف ہوسکتی ہیں۔ یہ سرطان زیادہ عمر کے لوگوں میں ہوسکتا ہے۔
مراسلے کے تحت قاری کی رائے سے لوگوں کو آگاہ کرایا گیا ہے۔ بالآخر کہا جا سکتا ہے کہ یہ شمارہ ہر لحاظ سے عمدہ اور قابل ذکر اور لائق توجہ ہے۔ 'خواتین دنیا' کے لیے نیک خواہشات!

سنیل کمار، فیض آباد، یوپی

□□□

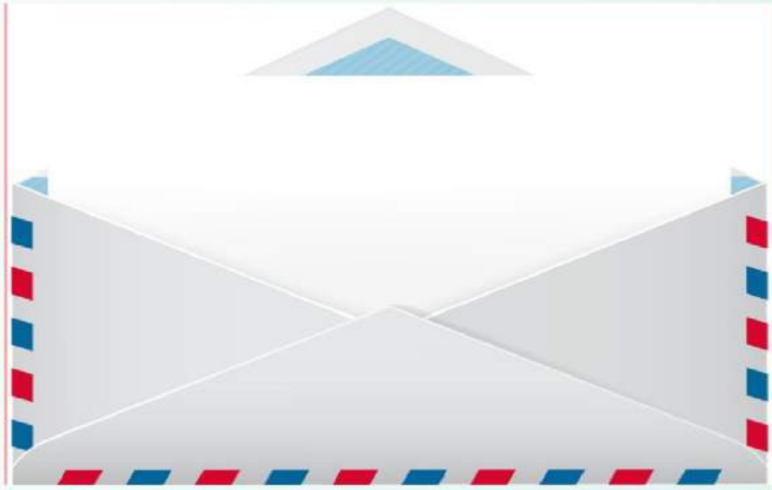

مراسلہ

خواتین دنیا ایک اچھی میگزین ہے۔ اس میں پیاری کہانیاں معلومات اور افسانے ہوتے ہیں۔ اس کا معیار بہت اعلیٰ درجے کا ہے۔
خواتین دنیا کے سبھی قلمکاروں کو مبارک باد۔

آپ کا نیازمند

بشن چودھری، منڈی گوبندگڑھ، پنجاب

'خواتین دنیا' کا تازہ شمارہ نومبر 2023 نظر نواز ہوا۔ کور پیج بہت دیدہ زیب ہے۔ اداریہ میں خواتین سے ان کی علم و فن میں مقبولیت کو سراہا گیا ہے۔ خواتین نے ہر میدان میں اپنی نمایاں کارکردگی سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی قابلیت کا اعتراف بہت بعد میں کیا گیا۔ علم و فن کے کسی بھی شعبے میں انھوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی اور زمانے کو باور کرا دیا کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔

مذکورہ شمارے میں کوئی دس مضامین شامل ہیں۔ شاہ راہ ادب سے Skywalk نکالنے والی فنکار: پروین شیر، قمر جمالی کی افسانہ نگاری، صحت مند معاشرے کی تعلیم میں تعلیم یافتہ خواتین کا کردار، اردو زبان و ادب کے فروغ میں دبستان مرشد آباد کا کردار، ما بعد جدید اردو افسانے کا نمائندہ نام: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، اردو میں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

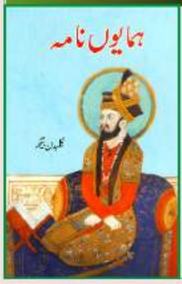

مصنف: گلبدن بیگم

چھٹی اشاعت: 2021

صفحات: 92

قیمت 55 روپے

دامان مریم

مصنف: محمد حسن، تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 192

قیمت: 160 روپے

اردو-ہندی لغت

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ

کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

کلیات امور طبیعیہ

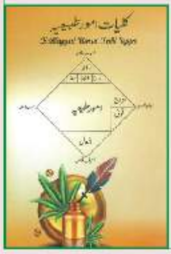

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, दिसम्बर - २०२३ वर्ष:७, अंक: १२
Mahnama Khawateen Duniya Monthly December 2023, Vol. 7, Issue: 12
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-12-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025